نظام کالج اردو میگزین

مجلس ادارت

محمد میر خاں غربت ایڈیٹر

میر طاہر علی خاں مسلم (سکریٹری)   برہان الدین حسین (منیجر)

قیمت سالانہ ([illegible])

ششماہی ([illegible])

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن میں چھپا

قواعد و ضوابط

(۱) "نظام کالج اردو میگزین" ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ تک شائع ہو جایا کرے گا۔ اگر ۲۵ تاریخ تک رسالہ وصول نہ ہو تو اسی مہینے کے اندر مطلع فرمائیے تاکہ دوسرا ارسال خدمت ہو۔

(۲) اس کی سالانہ قیمت مع محصول ڈاک (عہ ۴ ؍) ششماہی (عاا ۸ ؍) اور ایک پرچہ کی قیمت (۶ ؍) ہے۔ چھ آنہ کے ٹکٹ آنے پر رسالہ نمونۃً ارسال ہوگا۔

(۳) میگزین کی خریداری اور نرخ اشتہارات کے متعلق ٹکٹ بھیجکر منیجر سے استفسار فرمائیے۔

(۴) سیاسی اور مذہبی مضامین کسی حالت میں چھپ نہ سکیں گے۔ لہذا ایسے مضامین بھیجنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیے۔

(۵) تمام مضامین اڈیٹر کے نام ارسال فرمائیے۔ خوشخطی کا ضرور لحاظ رہے۔ ناقابل اشاعت مضامین واپس نہ ہو سکیں گے اور اڈیٹر کو حذف اور ترمیم کا حق حاصل ہوگا۔

منیجر

"نظام کالج اردو میگزین"
اسد باغ، نظام کالج،
حیدرآباد دکن

بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء
جلد(۱) نمبر(۱)

فہرست مضامین

۷۸۶

اِنتساب

(بنامِ نظامِ کالج)

اے کالجِ بے مثل! اے معیارِ تعلیم و کمال
اے شمعِ تہذیب و صفا، اے مصلحِ حسنِ خیال

اے ملک را سیراب کردہ بخششِ دریاے تو
اے آنکہ بر قلبِ دکن ثبت است احسانہاے تو

اے وہ کہ پُر اخلاص ہے اور زندہ دل تیری فضا
اے وہ کہ پنہاں ہے ترے ہر ذرّہ میں اک قہقہا

ہدیہ یہ تیری نذر ہے اور ہے خدا سے یہ دُعا
دُنیا میں جب تک تو رہے اور فیضِ تعلیمی ترا

جب تک ترے میدانوں میں فٹ بال اور ہاکی رہے
باقی ہے جب تک یونین اور اس کے بیجا قہقہے

جب تک تری بزمِ حسیں اک بارِ دُ جنّت رہے
اُس وقت تک یہ پھول تیرے ہار کی زینت رہے

(ایڈیٹر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقالۂ افتتاحیہ

منکہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب
مرغ اوصاف تو از اوجِ بیاں انداختہ

تمہید تہذیب قدیم میں عموماً اور تہذیب جدید میں خصوصاً جس کو عرف عام میں نئی روشنی سے تعبیر کیا جاتا ہے رسمِ تعارف ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تعارف کی یہ اہمیت چند حقیقی اور لازمی امور پر مبنی ہے۔ اُفق مشرق پر خونیں شفق کا پھولنا طلوع آفتاب کا اشتہار ہے۔ مرغانِ سحر کی زمزمہ پردازیاں آمد صبح کی نقیب ہیں۔ سرِ شام نیلگوں آسمان کے گوشۂ مغرب میں سُرخی لالہ زار کا نمودار ہونا اور شام کا سہانا سایہ ظلمتِ شب کے آثار ہیں خوشگوار روح افزا ہوائیں عروس بہار کی نوید جانفزا دیتی ہیں۔ اور بادِ سموم کے آتش افشاں جھونکے خزاں کی نکبت کے پیش خیمہ ہیں۔ جو کچھ کتاب میں ہوتا ہے اس کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ نفسِ مضمون کا پتہ اس کے عنوان ہی سے چل جاتا ہے۔ واعظ کی تمہید بول اُٹھتی ہے کہ وعظ کس مضمون کے متعلق ہوگا۔ کسی شئے کا عدم تعارف کثرت حیرت کا باعث ہوتا ہے اور تعارف اجنبیت اور تکلف کے موانع کو ہٹا دیتا ہے۔

نظر بریں امور ہم چاہتے ہیں کہ ناظرینِ کرام سے "نظام کالج اردو میگزین" کا تعارف بذریعہ مضمون ہذا کرایا جائے۔

مبدء فیاض نے حسب منشار تخلیق انسان کے دل و دماغ میں ایک عجیب قوت رکھی ہے جو ہمیشہ نئی

باتوں اور انوکھی اشیاء کا تجسس کرتی رہتی ہے۔ اسی پوشیدہ قوت کی وجہ سے انسان تغیر پسند واقع ہوا ہے یہ بالکل اس کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ ایک ہی حالت میں رہے۔

انسانی زندگی کے اُس زمانہ کی ورق گردانی کیجئے جبکہ وہ اوّل اوّل دنیا میں آیا تھا، جبکہ اس کو بود و باش کا سلیقہ تھا نہ کھانے پینے کی تمیز۔ وہ دُنیا و مافیہا سے الگ ایک حیوانی معصومیت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ عریانی اُس کا لباس تھا اور خدا کی کوسوں تک پھیلی ہوئی زمین اس کے رہنے کی جگہ تھی۔ سردی یا درندوں سے بچانے کے لئے پہاڑوں کے درے بڑے مستحکم قلعوں کا کام دیتے تھے۔ تہذیب و تمدن کی قیود اس پر عائد نہیں ہوسکتی تھیں۔ قانون عمرانیت اس سے کوسوں دور تھا اور زمانۂ موجودہ تک سیر کرتے چلے آئیے جبکہ انسان وہ انسان ہے کہ جس کے قبضۂ اقتدار میں ایک بڑی حکومت ہے۔ وہ کائنات کا مالک بلا شرکت مخلوق غیر ہے۔ وہ قوانین قدرت میں بہت کچھ تغیر و تبدیل کرسکتا ہے۔ برق اس کی تابع فرمان ہے، بھاپ اُس کی حلقہ بگوش ہے۔ غرض یہ اور اسی طرح کی ہزاروں عجیب عجیب حیرت انگیز سحر سازیاں کرتا ہے تو آپ کو ایک بڑے عظیم الشان انقلاب یا فلسفہ کی اصطلاح میں ارتقار کا پتہ چلیگا۔ انسان کی وہی فطری تغیر پسندی اور اس کا ایک وضع ایک حالت پر قائم نہ رہنا اس زبردست ارتقار کے اسباب و علل ہیں اگر انسان میں یہ ندرت پسندی نہ ہوتی تو وہ ایک ہی حالت میں پڑا رہتا جو منشاء تخلیق کے بالکل خلاف اور اسی وجہ سے ناممکن العمل ہے۔

یہی تغیر پسندی ہے کہ جس کی بدولت آج بنی نوع انسان ترقی کے ذریعہ بتدریج پتھر کے زمانہ سے دھات کے زمانہ میں آ داخل ہوے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کے منچلے دل و دماغ نے انقلاب برپا کرنے کے وسائل اور ذرائع دریافت کئے اور علم اس کام کے لئے سب سے زیادہ مفید مطلب آلہ ثابت ہوا۔ علم نے انسان کا تعارف خواص اشیاء سے کرایا اور اشیاء کے خیر و شر سے واقف ہونے کے بعد ان سے عملاً فائدہ اُٹھانا ایک بدیہی نتیجہ تھا۔

اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ انسانی زندگی کے عہد بعہد کی ترقیات کا سارا دار و مدار علم یعنے اشیاء کے

خواص سے متعارف ہونے اور عمل یعنے خواص اشیاء کے نفع وضرر کے مطابق فائدہ اُٹھانے پر ہے

علم و عمل

علم وعمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مگر دونوں کے معنے بالکل جدا جدا ہیں۔ دونوں کی سرحدیں الگ الگ اور بالکل نمایاں ہیں ایسی حالت میں دونوں کو متفق المعنی سمجھنا ایک بڑی بھاری اصولی اور معنوی غلطی ہے اور ایک سنگین جرم ہے کہ نا قابل عفو ہے۔

وہ بدبخت اقوام جو ادبار وزوال کے قعر مذلت میں بڑی نکبت ومفلسی کے جام تلخ کے گھونٹ گوارا کر رہی ہیں، علم وعمل کے معنوں میں تفریق نہیں کرتیں جن کے بُرے نتائج ان کو بھگتنے پڑتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ بے حس ہو کر حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔ جو قوم دُنیا میں اقبالمند ہوتی ہے اس کا علم عمل کے لئے ہوتا ہے یعنے وہ جس کارآمد شے سے واقف ہوتی ہے اس کو فوراً کام میں لانے کی کوشش کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ خدائے تعالیٰ ہر شخص کی کوشش کا ضرور اجر دیتا ہے۔

تعلیم کا کیا منشاء ہونا چاہیئے

تعلیم کا منشاء انسان کو عملی یعنے کام کرنے کے قابل بنانا ہے اور ایسی تعلیم بالکل بے فیض ہے جس سے ملک کے ہونہار طلبہ جن پر آئندہ نسلوں کا دارومدار ہے اور جن کی ہستیوں کے ساتھ ننگ وناموس وطن وابستہ ہے عملی نہ بنیں۔ اور آئندہ آنیوالی ذمہ داریوں اور فرائض بجالانے کے نا قابل رہیں۔ یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ لوگ اپنی عمر عزیز کا نصف یا نصف سے زیادہ حصہ تحصیل علم میں صرف کرنے پر بھی عملی دنیا میں گامزن ہونے کے قابل نہیں ہوتے۔ ہر سال ہندوستانی یونیورسٹیوں اور بڑی بڑی تعلیم گاہوں سے طلبہ ہزاروں کی تعداد میں فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ مگر ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو عملی دُنیا میں داخل ہو کر مادر وطن اور اپنے بھائی بندوں کی خدمت بجالائیں ہائے کاش ان بے شمار بی۔اے اور ایم۔اے حضرات میں سے دس فیصدی ایسے بھی ہوتے جو میدان عمل میں رہروی کرسکتے!

انہی تعلیم یافتہ لوگوں میں آپ نے اکثر ایسے حضرات بھی دیکھے ہوں گے جن میں قوت گویائی مفقود سی نظر آتی ہے اور جو اپنے ادائی مطلب پر بھی قادر نہیں ہیں اور انہی میں سے ایسے بھی

نظروں سے گزرے ہوں گے جو ایک صفحہ مشکل سے صحیح لکھ سکتے ہیں۔ کیا تعلیم کا یہی حاصل مطلب ہے؟ کیا عمر گرانمایہ کی تضیع کا یہی بے سروپا تعلیم نعم البدل ہوسکتی ہے؟ انہی تعلیمیافتہ بکمتوں کے لئے شاعر نے سچ کہا ہے کہ ع وہ کھوے گئے اور تعلیم پاکر۔

تمہید کی طوالت گرانبار خاطر ہوتی ہے کیونکہ طبیعتیں اصل مطلب کے سننے کی زیادہ مشتاق رہتی ہیں اور جو چیز اشتیاق کے مانع ہو وہ سخت تکلیف دہ ہوتی ہے لہذا ہم اسباب اشاعت اور رسالہ کے مقاصد اور اغراض پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔

اسباب اشاعت اسباب اشاعت کے لئے یہ کہدینا کافی ہوگا کہ نظام کالج کی (تخمیناً) بچاس سالہ تاریخ میں اس قسم کے پبلک رسالہ یا کم از کم اس قسم کی تحریک کی جگہ بالکل سادہ ہے ڈھائی سال پہلے موجودہ پرنسپل مسٹر برنٹ۔ ایم۔ اے نے اپنی نگرانی میں خاص اہتمام کے ساتھ ایک ایک سال کے وقفہ سے دو رسالے شائع کئے جن کا نصف حصہ انگریزی اور نصف اردو تھا۔ ان رسالوں کی اشاعت سے ناظرین کم واقف ہوں گے کیونکہ ان کے اغراض کسی طرح ماسوا ر کالج سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ اُن پر ادبی اور اخلاقی مجلے ہونے کا اطلاق ہوسکتا تھا۔ البتہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ کالج کے سال بھر کے تمام کاموں کی یعنے نتائج امتحانات، کھیل کود کے حالات، طلبہ کی حاضری اور تعداد، تقسیم انعامات، کلب کے حالات وغیرہ کی ایک رُوئداد ہیں اور اس کا مقصد خاص ہمارے خیال میں طلبہ قدیم اور جدید کے درمیان سلسلہ اتحاد کا قائم رکھنا ہے۔ آغاز ۱۹۲۲ء میں طلبہ کالج میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک اردو رسالہ نکالا جائے جس کا تعلق براہ راست طلبہ ہی سے ہو۔ مگر یہ خیال وسط سنہ رواں میں رونما ہوا یہاں تک کہ نظام کالج لٹریری یونین نے ایک سب کمیٹی کی مجلس کا انعقاد کیا جس میں اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ آیا میگزین نکل سکتا ہے اور اگر نکل سکتا ہے تو کس زبان میں؟ سب کمیٹی میں طے پایا کہ کالج سے اردو زبان میں ایک ماہوار رسالہ نکالا جائے جس کا نام "نظام کالج اردو میگزین" رکھا جائے

اس تحریک اور تصفیہ کے بعد یونین کی جانب سے مجلس مدیراں (اڈیٹوریل بورڈ) کا نفاذ عمل میں آیا جو پانچ اراکین یعنے اڈیٹر، سکریٹری، خازن، منیجر، اور معاون پر مشتمل تھی اُس آغاز کے بعد انجام یعنے اشاعت تک بیچارہ میگزین کو ہفت خوان رستم طے کرنا پڑا۔ وہ کئی دنوں تک خداوندان یونین کے معرض بحث میں پڑا رہا۔ جب وہاں سے گلو خلاصی ہوئی تو حصول اجازت کے لئے سر کے بل منزلیں طے کرنی پڑیں۔ بارے اب زیور طبع سے آراستہ ہوکر یہ ناچیز میگزین ناظرینِ کرام کی خدمت میں حاضر ہے۔

مقاصد اور اغراض اگر کسی ملک کی آنے والی حالتوں نظم ونسق اور عروج وزوال کا پتہ لگانا ہو تو وہاں کی درسگاہوں کا بغور مشاہدہ اور معائنہ کیجئے۔ اسی گروہ طلبہ میں آپ کو آئندہ نسلوں کے ذمہ دار افراد ملیں گے۔ انہی میں آئندہ سیاست مدن کی روح رواں ملیں گے۔ انہی میں وطن کی پاس ننگ وناموس پر جان نثار کرنے والے جرنیل ملیں گے انہی کے ہاتھوں میں ملکی اقتصادیات کی زمام ہوگی وہی فلاحت وتجارت صنعت وحرفت کے معاون ومددگار ہوں گے غرض تمام پیشہ اور تمام حرفوں کے لوگ آپ وہاں دیکھینگے مگر یہ اس وقت جبکہ اس درسگاہ میں تعلیم عمل دی جاے ورنہ اس کے برخلاف تمام واقعات کا برعکس عمل میں آنا قرین قیاس ہے اور اس ملک کی پستی اور زوال کے متعلق پیشین گوئی کرنی نہایت ممکن العمل ہے۔ ملک کا فارغ التحصیل یا تعلیم یافتہ گروہ اُس ملک کی جان ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی ذمہ داریاں اور فرائض طلبہ سے بھی زیادہ سخت اور اہم ہیں۔ ملکی نوجوانوں کی سوسائٹی ان کی تعلیم وتربیت اور اُن کے اعمال کی نگہداشت انہی کی ذات سے مختص ہے ان کے مطمح نظر ہمیشہ وہی باتیں رہتی ہیں جن سے علم وعمل کا چرچا ہو اور بغیر حفظ مراتب کے ہر شخص وطن کے لئے اپنے آپ کو مفید ثابت کرے۔ گروہ مذکور بھی اسی وقت کارآمد ہوسکتا ہے جبکہ وہ علم پر عمل پیرا ہو۔ مندرجۂ بالا امور کو پیش نظر رکھتے ہوے رسالۂ ہذا کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ اس کے اغراض ومقاصد یہ ہیں کہ یہ

بغیر کسی تخصیص یا امتیاز کے تمام طلبہ کا سچا رفیق و مشیر او رخیر طلب ہوگا۔ اس میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو ادبی ذوق رکھنے والے ناظرین کی تفریح طبع کا باعث ہونگے اور یہ اساتذہ جلیل القدر کے خوانِ کرم کا ذلہ خوار اور ان کی بیش بہا معلومات کا دریوزہ گر ہوگا۔ ہم خدائے برتر و لایزال سے صمیم قلب کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ اس کو طلبہ اور اہل علم کی خدمات کے لئے قبول فرما کر زندگی جاوید عطا فرمائے۔ ع

این دُعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

کالج کے طلبۂ قدیم سے استدعا دنیا میں انسان کو مذہب، وطن، ماں باپ، اور تعلیمگاہ سے زیادہ کوئی عزیز شئے نہیں ہے اور اگر بادی النظر میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی گردن انہی چاروں کے بیشمار احسانوں کی گرانباری سے جھکی پڑتی ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے انسان کو انسان اور اشرف المخلوقات بنایا۔ "سکندر اعظم" نے "اُستاد" کو "باپ" پر ترجیح دی تھی اور سبب یہ بتایا کہ باپ اُس کی روح کو پستی میں لایا اور اُستاد نے قوتِ علم سے اس کو پھر "عرش" تک پہنچا دیا۔ ہماری استدعا رکالج کے اُن فرزندوں سے ہے جو اس کی مبارک گود میں پھولے پھلے، نشو نما پائی اور زیور علم سے آراستہ ہو کر آج مادرِ وطن اور برادرانِ ملک کے جان نثار خدمت گذار ہیں۔ ہم اُن پر کالج کے استحقاق اور احسانات جتانا نہیں چاہتے بلکہ اس رشتۂ تعلق کی یاد دہی کرنا چاہتے ہیں جو ان کے اور ان کی جان سے زیادہ عزیز تعلیمگاہ کے درمیان ہے۔ اور بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہم قدم قدم پر ان کی اعانت کے طلبگار رہیں۔ اور آخر میں امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے عزیز کالج اور اُس کے حقوق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہماری کسی قسم کی مدد سے دریغ نہ کر کے ہمت افزائی فرمائیں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ بد قسمتی سے طلبۂ کالج نے جن کی تائید اور کثرت آراء پر اردو میگزین نکل رہا ہے اپنے دلوں میں کسی قدر بدگمانی کو جو صرف اوہام باطلہ ہیں جگہ دی ہے

ان کا یہ خیال ہے کہ مضامین کا معیار بہت بلند کر دیا گیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سوائے چند حضرات کے اور کسی کے مضامین نہ چھپ سکیں گے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میگزین کے کاروبار میں وہ کچھ اختیار نہیں رکھتے ان کو یقین ہو گیا ہے کہ اراکینِ مجلس مدیران استبدادی طریق پر کام کریں گے۔ میں ان تمام خیالات کی جن کو اوہامِ باطلہ کہہ چکا ہوں تردید کرنا فرضِ اولین سمجھتا ہوں اور اس تردید کے لئے صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ ہر طالبِ علم اپنے دل میں مندرجۂ ذیل سوالات کا جواب دے۔

(۱) پرچہ نکالنے کی تحریک کس نے کی۔ (۲) رسالہ کس کا ہے۔ (۳) کس کے فائدے کے لئے چھپ رہا ہے۔ (۴) اس کے اراکین کے اوپر کون حاکم ہے (۵) کیا اس میں جمہوریت نہیں ہے۔

یہ واضح رہے کہ طلبہ ہر وقت ہر کام اور ہر اس بات پر جو اُن کی خلافِ طبع ہو استفسار کر سکتے ہیں اور اُن کو کامل اختیار ہے کہ ہماری تمام غلطیوں کو ہاؤس میں پیش کر کے اپنے حسبِ دلخواہ عملدرآمد کرائیں۔ کہنا یہ ہے کہ اگر اسی طرح کی بدگمانیوں کو اہمیت دیکر میگزین سے آزردہ اور دامن کشاں رہیں تو اس کی کامیابی کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی اور ہم کو انجامِ کار کی نسبت ابھی سے دبی آواز میں کہدینا پڑیگا مصرع

من خود شوم ہلاک ترا اضطراب چیست

اس بدگمانی کی بلاشبہ کچھ اصلیت ضرور ہے۔ جس کی بناء یہ ہے اوّل اوّل کچھ مضامین ایسے وصول ہوئے کہ جن میں نہ ادب کی شان نمایاں تھی نہ وہ اخلاقی کہے جا سکتے تھے اور نہ ان پر فلسفہ اور سائنس کا گمان ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں ہم کو مجبوراً قلم انداز کرنا پڑا کہ سوا اس کے کچھ گذیر نہ تھا۔ زمانہ وہ نہیں رہا کہ معشوق کی تحقیق کمر میں عمریں گنوا دی جائیں یا انجنیرنگ کے فن کو اس کی زلفوں کی درازی کے ناپنے اور اُن کا طول و عرض نکالنے میں صرف کر دیا جائے یا کیمیا کو صرف اس تجربہ پر وقف کریں کہ لبِ لعلین پر مسّی کی دھڑی کیونکر

جمتی ہے یا دست حنائی پر واقعی عاشق کا خون دل ہے یا کوئی اور شئے یا تاریخ اسواسطے پڑھیں کہ ایاز اور محمود کے عشق کے افسانے معلوم کئے جائیں یا اسواسطے کہ محمد شاہ رنگیلے کی کتنی کنیزیں تھیں یا رنگیلے پیا جان عالم واجد علی شاہ نے کمال رقص کس سے حاصل کیا تھا۔ زمانہ وہ آگیا ہے کہ آپ پرانی لکیر کی فقیری چھوڑ دیں اور میدان عمل میں آکر جملہ علوم و فنون سے اصلی فائدہ اٹھائیں اور فائدہ پہنچائیں۔ جب تک آپ زمانہ کی پیروی نہ کریں گے یقین کیجیے کبھی ترقی کے پر فزا گلزار کی سیر و تفریح نصیب نہ ہو گی۔ اگر ہم کسی بی۔ اے کے طالب علم سے یہ درخواست کریں کہ وہ میگزین کے لئے ارسطو کے سوانح لکھدے تو کیا یہ خواہش اس کی قابلیت سے ماورا سمجھی جاوے گی؟ اگر سائنس اور ریاضی کے طلبہ سے یہ خواہش کی جاوے کہ وہ نئی نئی معلومات کو میگزین کے لئے ترجمہ کردیں تو کیا یہ خواہش مسترد کردی جاسکتی ہے ؟

راقم الحروف کی دلی خواہش ہے کہ میگزین کے لئے ایسے مضامین بھیجے جائیں جن میں معلومات کا عمدہ ذخیرہ موجود ہو جس سے تمام طالب علم استفادہ کریں۔ اردو کی غلطیوں کا خیال ہرگز نہ کرنا چاہئے کیونکہ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس سے غلطی صادر نہ ہو گی یہ وہ میدان ہے کہ جہاں بڑے بڑے لکھنے والوں کا شبدیز قلم سکندری کھاجاتا ہے۔ کوشش کرنا چاہئے کہ سلیس اور عام فہم اردو لکھی جاوے اور مطلب بآسانی ادا ہو جاوے۔ ادائے مطالب کے لئے مقفیٰ اور مسجع عبارت کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ اب اس کا زمانہ ہے۔ ہندو طلبہ کو چاہیے کہ وہ ہندوستان کے مشاہیر افراد کی سوانح اختصار کے طور پر لکھیں یا تاریخ ہندوستان پر کچھ خامہ فرسائی کریں۔

ہر اس طالب علم کو جو اردو لکھ سکتا ہے یا جس کو ایک آدھ پرچہ بھی یونیورسٹی کے امتحان میں لکھنا پڑے چاہئے کہ ہر مہینہ میں رسالہ کے واسطے ایک مضمون ضرور لکھے۔ امید ہے کہ طلبہ میرے دوستانہ مشوروں کو اگر وہ ان کے لئے مفید ثابت ہوں، قبول فرماکر میگزین کی طرف سے بدگمان نہ ہوں گے اور یکجہتی کے ساتھ اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں گے۔

معاصرین سے استدعا معاصرین محترمین سے استدعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے ہم پیشہ و ہم مشرب

ہونے کی وجہ سے مخالف یا موافق آرا سے مستفید فرماکر حقوق اخبار نویسی کو ادا کریں اور ہم ان کے مربیانہ اور دوستانہ مشوروں پر حتی الامکان کاربند ہونے کی کوشش کریں گے۔

سب سے آخر میں حضرات ناظرین کرام سے معافی کے خواستگار ہیں کہ مضمون کی طوالت نے آپ کے وقت کا ایک دلچسپ حصہ لے لیا ہے مگر مجبوری تھی کہ بغیر "تعارف" کے گزر نہ تھا۔ امید ہے کہ مقالہ افتتاحیہ ملاحظہ کرنے کے بعد اصل رسالہ سے محظوظ ہوں گے۔

ہو گیا شاداب عالم آ گئی فصل بہار
اُٹھ گیا پردہ، کھلا بابِ گلستانِ جمال

میر طاہر علی خاں متعلم سکریٹری

غزل

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد

بادۂ خمخانۂ توحید کا مئے نوش ہوں
چور ہوں مستی میں ایسا بیخود و مدہوش ہوں

گردپھرنے دے مجھے ساقی یہ میرا فرض ہے
مثل ساغر دور میں ہوں بادۂ سرجوش ہوں

محوِ ذوقِ معرفت ہوں اور مستِ عشق بھی
روزِ اول ہی سے میں وقفِ خمارِ دوش ہوں

طرزِ خاموشی مری بتلاتی ہے اس راز کو
ہوں نوا سنج حقیقت لاکھ میں خاموش ہوں

سب کی سن لیتا ہوں جی کی بات کرتا ہوں تمام
گرچہ ہوں سامع مگر میں نارسائے گوش ہوں

حال عبرت زا ہے میرا کب کسی کو ہے خبر
فارغ اندیشے سے ہوں میں محو نا و نوش ہوں

دردمندِ عشق ہو کر ضبط کا خوگر ہوں میں
صورتِ سیماب ہو کر پیکرِ خاموش ہوں

دیکھتا ہوں آپ اپنے میں تماشا میں ترا
پا گیا ہوں سرِ وحدت وہ حقیقت کوش ہوں

کس کی فرقت وصل کس کا اور ہے معشوق کون
شاد میں اس عالم تکوین سے ہم آغوش ہوں

میر ببر علی انیس

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

میر ببر علی انیس نے جس خونفشانی سے زبان اُردو کے پودے کو سینچا اور جس جانکاہی محنت سے اس کی دیکھ ریکھ کی اُس کو تمام اُردو دان پبلک نظر استحسان سے دیکھتی رہے گی حقیقت میں ان کے کلام نے جو تقویت کم مایہ اُردو کو بخشی وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی اگر اُن کا کلام زبانِ اُردو سے خارج کر دیا جائے تو اس زبان کو اپنی ترقی کے ایک زینہ سے اتر آنا پڑے گا۔ وہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں۔

نو سنجیوں نے تری اے انیس
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

قبل ازیں کہ میر صاحب کے محاسن کلام ناظرین کے سامنے پیش کئے جائیں، یا مختلف مسلم الثبوت اساتذہ کی رائیں جو اس خدائے سخن کے متعلق اُنہوں نے دی ہیں، لکھی جائیں یا اس تقابل کے چند اقتباسات جس میں مولوی سید امجد علی صاحب اشہری نے میر انیس کا مقابلہ مختلف مشہور شعرائے مغرب سے کیا ہے دُہرائے جائیں۔ یہ بہتر ہوگا کہ ہم پہلے ان کی زندگی پر ایک سرسری سی نظر ڈال لیں۔ اس مضمون کا مقصد صرف میر صاحب کی حیات کو ناظرین کے سامنے نہایت اختصار سے پیش کر دینا ہے۔ آئندہ انشاء اللہ تعالےٰ ان کے کلام سے بحث ہوگی

میر صاحب کے بزرگ تذکرۂ آب حیات سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب کے بزرگ ہرات سے آکر پرانی دلی میں آباد ہوئے۔ سید غلام حسین ضاحک میر صاحب کے پر دادا تھے۔ ان کی زندگی کے واقعات باوجود تجسس نہ معلوم ہو سکے۔ ان کے صاحبزادے میر غلام حسن تھے جن کی تصنیف میں مثنوی بدر منیر شہرۂ آفاق ہے۔ اس کی سلاست، روانی، خوبی بیان، بندش کی چستی

اور کلام کی نوک جھوک قابل داد ہے کسی خاص کیفیت کے بیان کرنے یا کسی منظر کا سماں کھینچنے میں
ید طولیٰ حاصل تھا۔ دہلی کی تباہی کے بعد ان باکمال حضرات کا گلدستہ، جس کو قدرشناس شاہان
دہلی نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا اور بڑی فراخدلی سے قائم رکھا تھا، تتر بتر ہونا شروع ہوا۔
شاہان اودھ نے جب اہل علم کی بربادی اور پریشانی دیکھی تو نہایت عالی حوصلگی سے ان کو اپنے
دربار میں جمع کرنا شروع کیا۔ اس طرح لکھنؤ نے پھر اس کتاب کی شیرازہ بندی شروع کی جس کے
اوراق باد سموم کے تند و تیز جھونکوں نے پریشان کر دئے تھے۔ میر ضاحک و میر حسن نے بھی
دہلی کو خیر باد کہا اور فیض آباد میں آبسے۔ میر حسن کا عنفوان شباب تھا یہ یہاں سے لکھنؤ گئے
جہاں ان کی خوش طبعی و شگفتہ مزاجی نے بہت جلد اپنا رنگ جما لیا۔ میر حسن دہلی میں خواجہ میر درد
اور لکھنؤ میں میر ضیاء الدین ضیاء سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کا انتقال لکھنؤ ہی میں ہوا اور
مفتی گنج میں مدفون ہیں۔

میر حسن کے بیٹوں میں خلیق اور خلق زیادہ مشہور ہیں۔ میر خلیق نے فیض آباد اور لکھنؤ میں
تربیت پائی۔ پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں مشق سخن شروع کی۔ ابتدا میں غزل کہتے تھے اور اپنے
والد بزرگوار سے اصلاح لیتے تھے بعد ازاں ان کو شیخ مصحفی کے سپرد کر دیا گیا۔ انہیں کے زمانہ
سے مرثیہ کے لئے مسدس کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ ورنہ اس کے پہلے مرثیہ چومصرعہ ہوا کرتا تھا۔

میر خلیق کے ہمعصر اور مدمقابل میر ضمیر تھے۔ ان دونوں اساتذہ کے مقابلہ سے بھی اردو کو وہی
فائدہ پہنچا، گو اس مقدار میں نہیں جو آئندہ میر انیس اور میرزا دبیر کے مقابلوں سے اور شاعرانہ
نوک جھوک سے ہونے والا تھا۔ میر ضمیر نے ایک مرثیہ حضرت علی اکبر کی شان میں کہا ع

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے

جس میں ایک خاص التزام رکھا یعنی پہلے ایک تمہید سے مرثیہ کا چہرا باندھا پھر سراپا لکھا۔
پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھا کر بیان شہادت پر ختم کر دیا۔ اس ایجاد نے مرثیہ کی دنیا میں ایک
انقلاب پیدا کر دیا اور پہلی روش متروک ہوگئی۔ میر خلیق کی زبان کے متعلق اتنا کہنا کافی ہوگا کہ

شیخ امام بخش ناسخ کہا کرتے تھے کہ اگر زبان سیکھنی ہے تو خلیق کے یہاں جایا کرو۔ میر خلیق کے تین صاحبزادے تھے۔ انیس، مونس، انس۔

میر انیس کی تعلیم و تربیت اور اُن کا علم میر انیس کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں لکھنؤ تشریف لائے یہاں بھی تعلیم کو جاری رکھا۔ بلحاظ علم اگرچہ کہ میر صاحب کو عالمانہ درجہ میں نہیں تسلیم کیا جاتا لیکن اُن کی معلومات علمیہ کا سب کو اقرار ہے۔ میر صاحب کی مختصر لیبریری میں ہر علم و فن کی مختلف کتابیں جمع تھیں پھر اکثر اعلیٰ درجہ کے علماء ادباء اور مستند باکمال حضرات آیا کرتے جن کے ساتھ گھنٹوں گفتگو رہتی۔ میر انیس اس امر میں نہایت خوش قسمت تھے کہ ان کی تربیت گھر میں ہوئی جہاں ان کو اپنے والدین کی حسن معاشرت اور اعلیٰ درجہ کے اخلاق دیکھنے اور ان کو اپنی آئندہ زندگی کے لئے نمونہ بنانے کا بہترین موقع ملا یہی وجہ ہے کہ میر انیس کے واقعات زندگی میں متانت، وضع داری اور خودداری نہایت نمایاں جوہر ہیں۔ میر صاحب کی والدہ ایک پابند مذہب اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں، جن کی طرز معاشرت دوسروں کے لئے شریفانہ وضع کا مستند نمونہ سمجھی جاتی تھی۔

فنونِ سپہ گری میر صاحب کی رزمیہ نظم پڑھیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا میدانِ جنگ میں کھڑے لڑائی دیکھ رہے ہیں یا کوئی ایسا شخص جو اس فن میں کامل دستگاہ رکھتا ہو، اور ہر چوٹ کے نام سے واقف ہو، جنگ کو اس فن کی زبان میں بیان کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر صاحب اس فن سے خوب واقف تھے۔ فنون سپہگری میں میر کاظم علی اور ان کے بیٹے میر امیر علی کے شاگرد تھے۔ ان سے میر صاحب نے عملاً لکڑی کا ٹھاٹھ اور بانک بنوٹ کی کچھ گھائیاں سیکھیں اور اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ بعض بعض مقام پر میر امیر علی پر بھی چوٹ کر جاتے تھے۔ میر امیر علی کہتے تھے کہ میر صاحب کو اس عمر میں بھی اپنے رکھ رکھاؤ کا اس قدر خیال تھا کہ کبھی ننگے بدن مشق فن نہ کرتے تھے بلکہ اس کے مناسب کپڑے بنوائے تھے انہیں کا قول ہے کہ اگر میر صاحب کے ہاتھ میں ایک گز لٹھے کے رومال میں ممدو شاہی پیسہ

بندھا ہوتا تو وہ دس لکڑی پھینکنے والوں سے بھی چوٹ نہ کھاتے اور ان کی چوٹ مشکل سے بچائی جا سکتی تھی۔

ورزش ورزش کے بھی عادی تھے اور اس کے اخیر وقت تک پابند رہے ضعیفی میں بھی پچاس ساٹھ ڈنڈ پیلنا اور سَو دو سَو بار مگدر ہلا لینا ان کے نزدیک زیادہ مشکل نہ تھا۔

احساس حسن ہر شاعر کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے۔ میر صاحب کی طبیعت نہایت حسن پسند واقع ہوئی تھی۔ ہر چیز میں محاسن قدرت کا نظارہ بڑی دلچسپی سے کرتے تھے حسن کا اظہار اُن کے کلام سے بخوبی ہوتا ہے۔ وہ نہایت پاکیزگی سے ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جنکو ایک حسن پرست ہی محسوس کر سکتا ہے صبح و شام کا منظر، ان اوقات میں طیور کی حالت، باغوں کی کیفیت، کلیوں کی چٹک، پھولوں کی مہک، ان سب چیزوں کا بیان کرنا انہیں کا حق ہے۔ ہماری اصطلاح میں میر صاحب "آل راؤنڈ چیمپین" تھے یعنی شاعری کی فیلڈ میں جتنے کھیل کھیلے جاتے ہیں سب پر حاوی تھے۔

وضع اور وضع داری "میر انیس لکھنؤ میں اسوقت تشریف لائے جبکہ درباری لباس ایک خاص تہذیب کا پابند تھا اور ثقات شہر نے اپنے لئے ایک خاص وضع اختیار کر رکھی تھی جو دلی کے بعد لکھنؤ کے لئے خاص سمجھی جاتی تھی اور اسکو دیکھ کر لکھنؤ کی بود و باش کا امتیاز ہوتا تھا" میر صاحب نے جو لباس اس وقت اختیار کیا وہی آخر وقت تک پہنتے رہے سر پر لکھنؤ کی بھینا وی بیچ گوشہ ٹوپی جس کو درستگی اور خوبصورتی سے اوڑھنے میں ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ جسم پر ایک خاص وضع کا گھیر دار کرتا، یا گول پردہ کا انگرکھا پہنتے تھے۔ پیجامہ لکھنؤ کے عام رواج کے موافق غرارہ کا ڈھیلا ہوتا تھا۔ جن حضرات نے دولہ صاحب کو منبر پر دیکھا ہے وہ بخوبی تصور فرما سکتے ہیں۔

سید امجد علی صاحب اشہری تحریر فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں نواب تہور جنگ بہادر نے سالار جنگ بہادر کے ایما سے میر صاحب کو طلب فرمایا، اور مجالس منعقد کیں تو سر آسمانجاہ

نے بھی میر انیس کو اس شرط پر پڑھوانا چاہا کہ وہ پیچ گوشہ ٹوپی کے عوض حیدر آباد کی منصبداری پگڑی پہنکے مرثیہ پڑھیں۔ پانچ یا دس ہزار روپیہ دینے کے لئے کہا تھا لیکن میر صاحب نے منصبداری پگڑی پہننے کو منظور نہ کیا۔

انتقال میر انیس مرحوم نے بہتر برس کی عمر پائی اور ۱۲۹۲ھ میں اس دار فانی سے رحلت کی۔

رباعی

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رخ سب سے پھرا کے منھ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
میں نے بھی تو جان کھو کے پایا ہے تجھے

میر محمد باقر

فلسفۂ شہرت

روح انسانی فطرتاً ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ قصد کرنے میں سست اور انجام دہی میں دھیمی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے قدرت نے انسان میں جذبات کو ودیعت کیا۔ انہی جذبات کی وجہ سے ہے جو روح میں کام کی پھرتی اور مقاصد کی بجا آوری کا شوق نظر آتا ہے۔ ہمارے تمام جذبات روح میں چستی پیدا کرتے ہیں وہاں اشتیاق شہرت کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ انسان کو ایسے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے جن کی وجہ سے اُسے شہرت اور عزت حاصل ہوتی ہے۔ اس جذبہ کی وجہ سے دنیا میں اور بھی کئی چیزیں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں یہ ضرور تھا کہ دُنیا میں نئے نئے فنون ایجاد ہوں، کتابیں تالیف ہوں، اقوام مہذب بنائی جائیں، مگر چونکہ اس طرف صرف معدودے چند نیک خصلت اشخاص کی توجہ مبذول ہو سکتی ہے اس لئے قدرت نے ان وسیع امور کی بجا آوری کے لئے ایک ایسی عام چیز ہر شخص میں ودیعت کر دی جو اُسے ایسے امور کی انجام دہی کی ترغیب دلاتی ہے۔ اسی چیز کا نام ذوق شہرت ہے۔ اس جذبہ کا ایک معمولی انسان پر بھی ایسا زبردست اثر ہوتا ہے کہ وہ

اپنی تن آسانی اور آرام کو قربان کر کے ان امور کی بجا آوری پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر اس جذبہ کو انسان پر ایک زبردست گرفت حاصل نہ ہوتی تو ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے جن کا اُسے اُس کے حاصل کرنے میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اُن دشواریوں پر نظر کرتے ہوئے جو اُسے حصولِ شہرت کے بعد اس کے برقرار رکھنے میں پیش آتی ہیں، ممکن نہ تھا کہ ایک ذی عقل انسان ایسی بے سود اور شاندار چیز کے لئے سرگرداں رہتا۔

حصولِ شہرت کی مشکلات قانون قدرت کا مقصد ہے کہ وہ انسانوں کی قابلیتوں میں مساوات قائم رکھے چنانچہ اگر ایک انسان کسی ایک کام میں کمال حاصل کرتا ہے تو دوسری باتوں میں کمزور رہ جاتا ہے۔ ایسے اشخاص بہت کم ہیں جن کے کمالات قابلِ داد ہوں۔ اگر کسی شخص کو شہرت نصیب بھی ہوئی تو فوراً ہی اُس پر حسد، تہمت اور طعن کی بوچھار ہونے لگتی ہے۔ اور اگر کسی نے اسکی تعریف بھی کی تو بطور احسان، یا حسد سے اتنی تھوڑی کہ اُس سے خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ایک شخص جس قدر شہرت کا آرزومند ہو گا، اُتنا ہی وہ اُسکے حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔ اور ایسے لوگ بہت کم ہیں جو نیک کام بغیر کسی لالچ کے کرتے ہیں اسی نیک نیتی کی وجہ ہے کہ اُنہیں شہرت خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ سب سے سخت مشکل جو اس راہ میں پیش آتی ہے وہ ریا ہے۔ شہرت حاصل کرنے کی غرض سے انسان اپنی قابلیتوں کا لوگوں پر اظہار کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا کریہہ اور بیہودہ فعل ہے جس کی وجہ سے اُس شخص کی عزت لوگوں میں کم ہونے لگتی ہے اور لوگ اُسے ریاکار پکارنے لگتے ہیں۔ پس شہرت کا حاصل کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے اور ریاکاروں کے لئے تو حد درجہ مشکل ہے۔

شہرت برقرار رکھنے میں دشواریاں ایک ایسے شخص کو جس نے شہرت حاصل کر لی ہو، دو زبردست دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو کسی وقت اس کے ہم پلہ تھے اور دوسری طرف وہ جو کسی وقت اس کے بالا دست تھے۔ یہ دونوں گروہ اسی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اس شخص کو رسوا کریں۔ اور اس کی شہرت کو خاک میں ملا دیں۔ کیونکہ وہ ان دونوں کی

آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ بعض لوگ فطرت سے عیب جو ہوتے ہیں۔ جہاں تمام لوگ ایک شخص کی تعریف کرتے ہیں، وہاں یہ اُس کی کمزوریوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں کہ ہمنے ایک ایسی چیز کو رونما کر دیا جسے عام لوگ نظر انداز کر گئے تھے۔ ایک نامور شخص کے نقائص کا اظہار کرنے سے بعض لوگوں کا مقصد اُس خوشی سے بہرہ اندوز ہونا ہوتا ہے جو انہیں اس خیال سے حاصل ہوتی ہے کہ وہ خود اُن نقائص سے مبرا ہیں۔ اور اس طرح ایک نامور شخص سے بھی بعض باتوں میں برتر ہیں۔ وہ لوگ جو کسی مشہور شخص سے صرف عیوب میں مناسبت رکھتے ہوں اس کی کمزوریوں کا تذکرہ بڑے زور شور سے کرنے لگتے ہیں۔ ایسا کرنے سے شاید اُن کا مقصد یہ ہوتا ہوگا کہ وہ خود در گذر کر دئے جائیں یا اس بات کا اظہار منظور ہوتا ہوگا کہ وہ ایک مشہور شخص سے مناسبت رکھتے ہیں۔

ان عیب جو لوگوں کے علاوہ ایک اور مشکل ہے جو شہرت کے برقرار رکھنے میں پیش آتی ہے شہرت کے بعد انسان پر لازم آتا ہے کہ وہ ترقی کرتا جائے۔ ورنہ جس طرح ایک ایسی چیز سے جس سے بیحد اُنس ہوگیا ہو رفتہ رفتہ نفرت ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح اندیشہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی توقیر کم ہوتی جائے اس لئے ایسے شخص کو چاہیئے کہ وہ نیک کاموں کا سلسلہ جاری رکھے

شہرت کی خصوصیات عام لوگوں کی اُمید کے برخلاف شہرت میں بمقابلہ اُن ہزاروں بیچینیوں کے جو اس کے ساتھ سایہ کی طرح رہتی ہیں بہت تھوڑی مسرت ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں آدمی اس خفیف سی خوشی کے لئے تکلیفیں اُٹھاتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے۔

شہرت کے اشتیاق کی کوئی حد ہی نہیں۔ ایک شخص اچھی خاصی شہرت حاصل کرنے پر بھی ایسا ہی مشتاق نظر آتا ہے، جیسا کہ وہ شہرت حاصل کرنے کے پہلے تھا۔ دنیا میں اب تک جو شخص تحصیل شہرت سے دست بردار ہوا وہ اکثر اس وجہ سے کہ کہن سالی اور نا امیدی

نے اس کا دل توڑ دیا یا اس وجہ سے کہ اُس میں بالکل تھوڑی خوشی پائی جاتی ہے؛ اس وجہ سے تو کبھی نہیں کہ اُس نے تسلی بخش شہرت حاصل کر لی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ شہرت میں اطمینان اور مسرّت بالکل تھوڑی اور بے چینیاں بے انتہا ہیں۔ اس کے تمتع میں مسرّت خفیف سی ہے اور اس کے زوال یا احتیاج میں حد درجہ کی بے چینی اور تکلیف۔ اور یہ خفیف سی مسرّت بھی ایسی غیر متعین اور مشکوک ہے کہ اس کا انحصار دوسروں کی مرضی پر ہے۔

جب انسان بے انتہا مشقت کے بعد اپنے مقصد پر پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جس کے حاصل کرنے میں اتنی محنت صرف کی تھی، ہرگز اُس محنت کے قابل نہ تھی۔ اے ذوقِ شہرت! بربادی عمر اور بے چینیٔ دماغ تیرے ہی ثمر ہیں" (لارڈ بائرن)

(ماخوذ از اڈیسن) محمد نصیر خاں

تضمین

با من آمیزش او اُلفت موج است و کنار

دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

بیخودی تیرے ہیں محتاج جہاں میں ہشیار
روشنی طبع کی ثابت ہوئی وجہ آزار

حسن کی عشوہ گری کا کوئی حد ہے نہ شمار
میں ہوں پابند وفا وہ ہیں وفا سے بیزار

رحم کر سوزِ درونی کہ جلا جاتا ہے
دلِ مایوس جو مشہور ہے منزل گریار

اے عجب آمدی اکنوں بہ سرِ مدفنِ او
اے کہ دیدی نہ سرِ عاشق خود بر سردار

طائرِ خلد کو دُنیا کا چمن زنداں ہے
جسمِ خاکی سے بری روح منزہ کو ہے عار

بننا مشکل ہے ہر اک شئے کا بگڑنا آسان
سہل انسان کا مرنا ہے پہ جینا دشوار

مضحکہ خیز ہے انسان کی بے بال و پری
تلخیٔ مرگ کو کرنا ہے گوارا ناچار

قطعہ

او زبردست ضعیفوں کو ستانے والے — تجھ سے پہلے بھی تھے عالم میں ہزاروں جبّار
کر دیا سرد دم سرد نے سارا جبروت — قبر میں جا کے ہوئے مور و ملخ کے وہ شکار
ہڈیاں پس گئیں سرمہ کی طرح زیر زمیں — سو عذابوں کا عذاب ایک لحد کا تھا فشار
کاسۂ سر ہوئے دریوزہ گری کے کشکول — لے اڑی صرصر مسموم جو تھا مشت غبار
نہ بچا دور زمانہ سے جہاں میں کوئی — قصر کسریٰ کا ہے باقی نہ ہے قیصر کا مزار
پائمالی کی مثالیں ہیں ہزاروں غافل — منظر عبرت عاقل ہیں ہزاروں آثار
ہاں بتا مجھکو ذرا قیصر جرمن کیا ہے؟ — میں سناتا ہوں تجھے زار کی کچھ حالت زار
نیک نامی کو بقا ہے فقط اس دنیا میں — عرصۂ ہستی انسان ہے ایک رقص شرار
کس لئے ہم ہیں ہر اک کام میں پیچھے یارب — کیا ابھی تک نہ گیا نشۂ حکومت کا خمار
مفتیٔ دین کی تکفیر کا کھٹکا نہ رہا — میرے ایمان کے ضامن ہیں بتان عیّار
صبر رخصت ہوا دل سے مرے یوں ہجر کی شب — آجکل جیسے مسلمانوں سے قومی ایثار
مشرقی ہو گئے سب قیس کے سجادہ نشیں — واہ ری لیلئ مغرب ترے غمزوں کے نثار
کہدے یہ باد سحر زود پشیماں سے مرے — ہوا منت کش عیسیٰ نہ تمہارا بیمار
استخوانہائے شکستہ میں مرے جان آ گئی — کون آیا ہے الٰہی مری بالین مزار
ہمہ تن گل ہوں میں اور نکہت گل ہے وہ نگار — با من آمیزش او الفت موج است و کنار
دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

مسلم

نظامِ انجم

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

جدید تحقیقات ہیئت و طبیعات سے نظامِ انجم کے متعلق چند دلچسپ باتیں ماخوذ ہوتی ہیں۔ موجودہ حالت میں جب کہ انسان کے ذرائع معلومات باوجود اس قدر ترقی کے نہایت ناقص اور کمزور ہیں، کائنات کی مادی کیفیت کے متعلق کوئی رائے بھی مستند نہیں سمجھی جاسکتی لیکن ہر وقت انسان کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنی معلومات کے لحاظ سے استدلال کرکے نتائج حاصل کرے۔ اس لئے مندرجۂ ذیل مضمون جو سائنیس دانوں کی موجودہ رائے کا خلاصہ ہے ناظرین کے استفادہ کی غرض سے پیش کیا جاتا ہے۔

اندھیری رات میں جبکہ مطلع صاف ہو، کسی بلند مقام سے آسمان کی طرف دیکھا جائے تو خواہ کوئی موسم ہو ستاروں کے عجیب و غریب گروہ مختلف شکلوں میں بظاہر غیر مرتب کہیں بکھرے ہوئے کہیں گنجان نظر آتے ہیں۔ دیکھنے والے کو غالباً یہ گمان ہوتا ہے کہ اگرچہ فضاء میں وسیع پیمانہ پر مادہ پھیلایا گیا ہے، لیکن اس میں نہ ترتیب ہی کا خیال رکھا گیا ہے اور نہ مقدار کا۔ اگر مشاہد غائر نظر رکھتا ہے تو پہلی نگاہ ہی سے پہچان لیگا کہ آسمان کے ایک سرے سے لیکر مقابل کے سرے تک ایک وسیع منطقہ ہے جس میں ہر قسم کے ستاروں کی کثافت باعتبار اور حصّوں کے اعظم ہے۔ معہذا اس منطقہ میں روشن ترین ستارے درخشاں ہیں۔ ہماری زبان میں قدیم زمانے سے اس کے لئے کہکشاں کا نام چلا آرہا ہے۔

مختلف زمانے کی مختلف اقوام نے اس کے لئے عجیب و غریب نام دے رکھے تھے۔ بعضوں نے اس کو سُرگ کی گلی، کہا ہے بعضوں نے روحوں کا راستہ اور ایشیائی شعرا نے اس کو معشوق کی مانگ کہا ہے جدید تحقیق سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ یہ رقبہ کروڑہا ستاروں سے مملو ہے۔ ہمارا "نظامِ انجم" زیادہ تر

اسی پر مشتمل ہے۔ نظام شمسی جو اس وسیع نظام کا ایک حقیر ذرہ ہے اس کے وسطی مقام سے کسی قدر اوپر اور بازو کی طرف ہٹا ہوا واقع ہے۔

اگر یہ ممکن ہو کہ کسی ذریعہ سے ہم ایسے مقام پر پہنچیں جو اس قطعہ سے نہایت دور ہے اور وہاں سے اس کی طرف نگاہ ڈالیں تو ہمیں یہ کل کائنات ایک چپٹے (Spiral) کی شکل میں دکھائی دیگی جس کی خمدار شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہونگی۔ اس نظام انجم میں مختلف مدارج کے ستارے موجود ہیں، جو باعتبار مقدار نور، کمیت اور حجم کے ایک دوسرے سے انتہادرجہ جداگانہ ہیں۔ تمام ستاروں کے فوٹوگراف (عکس) جمع کرکے ریاضی کے ذریعہ سے ان کی کثافت وغیرہ کا حساب کرنے سے یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ ستاروں کی تعداد نامتناہی نہیں ہے بلکہ محدود اور کم و بیش تین ہزار ملین (۳۰۰۰۰۰۰۰۰۰) سے متجاوز نہیں ہے۔ اس میں زیادہ تر دو قسم کے ستارے شامل ہیں۔ ایک قسم کے ستارے کہکشاں کے مستوی میں ایک جانب بہے چلے جارہے ہیں، دوسری قسم کے اس کی مقابل جانب۔ پہلی جماعت کو دوسری جماعت کے ساتھ باعتبار تعداد $\frac{۳}{۲}$ نسبت ہے اور ان کی رفتاروں کو باہم دیگر $\frac{۲}{۱}$ یا $\frac{۱٫۶۵}{۱}$ کی نسبت ہے۔ ان کے علاوہ بعض ایسے بھی گروہ ہیں، جو ان سے بالکل علیحدہ مگر ایک معین رفتار ایک معین سمت رکھتے ہیں۔

اسی طرح دب اکبر کے پانچ ستارے ایک مخصوص سمت میں منتقل ہو رہے ہیں۔

عقد ثریا کے تقریباً سب ستارے اپنی ایک خاص سمت میں رواں ہیں۔ کہکشاں کا قطعہ نہ صرف بلحاظ کثرت ستارگان بلکہ اس اعتبار سے بھی خصوصیت رکھتا ہے کہ وہ نوعمر اور جدید ستاروں کا گہوارہ ہے۔ اکثر ستارے اس قطعہ کے سفید یا نیلگوں ہیں۔ بہت کم سرخ یا نارنجی ہیں۔ ان کی رفتار بھی کم ہے۔ بعض اوقات یہاں اچانک جدید یا ہنگامی ستارے بھڑک اٹھتے ہیں۔ جن کی پیدائش کا حال ایک لاینحل معمہ ہے۔ اکثر لوگوں کو یاد ہوگا کہ ۱۹۱۸ء میں برج عقاب میں نہایت سرعت کے ساتھ ایک نو وارد ستارہ وجود میں آیا تھا، جو بڑے بڑے مستقل ستاروں سے بھی بظاہر روشنی اور مقدار میں سبقت لے جاتا تھا۔ چند روز تک یہی کیفیت رہی اور پھر وہ جلد جلد دھندلا ہوتا چلا۔

بالآخر دوربین کی مدد سے بھی مشکل نظر آنے لگا۔ ایک اور دلچسپ بات جو کہکشاں کے قطعہ کیلئے مخصوص ہے، یہ ہے کہ اس میں سبز رنگ کے گیسی (نیبولے)، (Nebulae) (مخلوط رقیق فلکی مادے) بافراط جمع ہیں جو ثوابت اپنے اندر لئے ہوئے اور اُن کے ساتھ مختلف ہیئتوں سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ گویا ان ثوابت اور نیبولوں کا مبداء ایک ہی ہے۔ ہمارا آفتاب بھی اس گہوارے کا پلا ہوا ایک ستارہ ہے اس کی موجودہ اضافی رفتار فی ثانیہ (۱۲) میل ہے۔ مثل اور ستاروں کے کہکشاں سے نکلتے وقت اس کی رفتار کم تھی۔ اس کی تنویر حالتِ موجودہ سے ابتدائً بہت زیادہ تھی اور رنگ نیلگوں سفید تھا۔ کہکشاں کے مستوی سے جوں جوں دور ہٹتا چلا رفتار بھی بڑھتی گئی اور عمر میں ترقی ہو کر اب وہ بڑھاپے کا جنم اختیار کر رہا ہے۔

فی الحقیقت اس کا رنگ اس وقت زردی مائل ہے اور جیسا کہ اس کے واغہائے دوری سے پتہ چلتا ہے اس کی حرارت اور تنویر میں اب نمایاں انحطاط پیدا ہونے لگا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ از روئے تحقیقاتِ طبقات الارض تقریباً ایک لاکھ سال سے انسان زمین پر بود و باش کر رہا ہے۔ اس عرض مدت میں اگر آفتاب میں کمی پیدا ہوتی، تو انسان کا ترقی کے ساتھ زندگی بسر کرنا ناممکن ہوتا۔ اگر بروئے اوسط آفتاب کی رفتار ۱۲ میل فی ثانیہ فرض کی جائے تو اس ایک لاکھ سال کی مدت میں آفتاب نے جو فاصلہ طے کیا ہے، اس قدر کثیر ہے کہ نظام انجم کی ظاہری شکل (جو کرۂ زمین سے نظر آتی ہے) بڑی حد تک بدل گئی ہے۔ برجوں کی شکلیں بالکل جداگانہ ہو گئیں۔ چھوٹے ستارے نزدیک پہنچنے سے بڑے دکھائی دینے لگے اور بڑے ستارے دور ہو کر چھوٹے نظر آنے لگے۔

چونکہ آفتاب پر اب بڑھاپا طاری ہو رہا ہے، اس کی کثافت بڑھ رہی ہے۔ رنگ سرخی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور بتدریج رفتار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چند کروڑ برس کے عرصہ میں گمان غالب ہے کہ آفتاب اس رفتار کی وجہ سے موجودہ مقام سے نہایت دور چلا جائے گا۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ انجم کی حرکت بھی محدود حلقوں میں ہوتی ہے۔ شاید آفتاب بعید ترین مقام تک

پہنچ کر پھر اپنے مقام نفوذ پر واپس آجائے۔ اس طویل گشت میں اغلب ہے کہ ابتک وہ کسی اور ستارہ سے خواہ وہ روشن ہو یا تاریک ٹکرایا نہیں۔ صرف ایک نظریہ کی رُو سے یہ پایا جاتا ہے کہ اس کے سیارے اور توابع نے جو اس سے نکلکر موجودہ صورتیں اختیار کی ہیں اس کی وجہ یہ ہے ہمارا آفتاب جب اور بھی زیادہ رقیق تھا۔ بھٹکتے بھٹکتے ایک دوسرے کافی بڑے ستارہ کے میدان اثر میں داخل ہوا اور اُس کے مد و جزر سے اس کے مادّے کو ہیجان ہو کر مختلف اوقات میں مختلف ٹکڑے علیحدہ ہو گئے۔ چونکہ از روے تحقیقات جدید نظام انجم محدود ہے اس لئے غالباً آفتاب اپنے توابع کے ساتھ اس کے اندر ہی گھومتا رہے گا۔ اس کے چھ سات چکر ہونے تک پیرانہ سالی حد سے تجاوز کر جائے گی اور وہ ایک سرد اور سیاہ مٹّی کا ڈھیر ہو جائے گا اس سے مدتوں پہلے اس کے سیارے تودۂ خاک ہو جائیں گے۔ نہ کوئی اُن پر نباتات باقی رہیں گے نہ حیوانات۔

"تجسس"

طوفان حیات اور غافل انسان

بیا جاناں تماشا کن کہ در انبوہِ جانبازاں
بصد سامان رسوائی سرِ بازار می رقصم

فخر شعراے یورپ ولیم شیکسپیر نے اس دُنیاے فانی کو اس کے اصلی و بدیہی معنوں کا لحاظ کرتے ہوے اسٹیج سے تشبیہ دی ہے اور اس میں رہنے والوں کو ایکٹروں سے تعبیر کیا ہے جو اس تماشہ گاہِ عالم کی اسٹیج پر آتے ہیں اور جو کچھ کام ازل سے سپرد کیا گیا ہے اس کو حتی الامکان انجام دیکر لَوٹ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی ایک حباب ہے۔ نگاہ پڑی اور ٹوٹا۔ کچھ دیر پانی کی سطح پر اپنی پُوری اُبھار اور سرافرازی سے نمودار ہوتا ہے۔ خدا جانے کن اثرات سے متاثر ہو کر پلک جھپکنے سے قبل، ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔ اس کا پتہ نہیں چلتا کہ

کہاں سے اور کب نمودار ہوا تھا کس نے کس وقت اور کس وجہ سے مٹا دیا بس حیات کو بھی حباب ہی سمجھ لو۔ صرف لفظوں کا دھوکا ہوتا ہے ورنہ دونوں ایک ہیں۔ مناسب یہی تھا کہ حیات کے جھگڑے کو حباب کے استعارے اور تشبیہ سے طے کر دیا جاتا مگر خدا معلوم جب سے اس تماشہ گاہِ عالم کی اسٹیج سے ڈراپ اُٹھا کیسے کچھ حیرت انگیز اور حیرت خیز تماشے ختم ہو چکے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس اسٹیج پر آئندہ کیا کیا (سین) منظر نظر آئیں گے اور کیا کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ اور کتنے ہی سرسبز فرحت بخش باغ ہوں گے جن کی جمعیت کسی وارفتہ کے خیال کی طرح یا کسی ماہرو کی زلفِ پریشاں کی طرح منتشر ہو جاے گی۔ کتنے ہی خوش رنگ خوبصورت بھینی بھینی بو والے پھول کھلیں گے اور بادِ سموم کے ناگوار زہریلے جھوکوں سے مرجھا جائیں گے۔ عالی شان سر بفلاک خوبصورت مضبوط و مستحکم عمارتیں ہوں گی جو حوادث زمانہ سے منہدم اور رفتہ رفتہ معدوم ہو جائیں گی۔ کتنے ہی خاندان ہوں گے جو بن بن کر بگڑ جائیں گے۔ کتنی سلطنتیں قائم ہوں گی جن کی بساط حکومت درہم و برہم ہو جاے گی۔ کئی سر جو تاج کی زیبائش کی وجہ، فخرِ قوم، فخرِ ملک، مانے جائیں گے وہ بھی خاک آلود ہو کر ایک نا معلوم وقت تک خاموشی کی زندگی شہرِ خموشاں میں بسر کریں گے۔

اس عالمِ ناپائیدار کی سخت جانی پتھر کو بھی شرماتی ہے۔ افریقہ کے صحرا کو کھود کر سمندر بنا دینا، بیستون کو کاٹ کر جوے شیر بہانا، ہفتخواں کا راستہ طے کرنا، آسمان کے ورق الٹ دینا، زمین کے طبقات زیر و زبر کر ڈالنا یہ سب اس کے لئے آسان ہے۔ اس موہوم حباب کی ہمت دیکھو کہ ان مشکلات کو کچھ بھی دھیان میں نہیں لاتا۔ اتنا بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کل کیا ہوگا۔ ایک پل کا بھروسہ نہیں لیکن کل کائنات کا بوجھ اُٹھانے کو تیار ہے۔ ایک سانس کی مہلت نہیں مگر ہفت اقلیم کا انتظام کر رہا ہے جوں جوں اس حباب کو بڑھتا ہوا دیکھا ہوگا اُتنا ہی زیادہ اپنا رنگ جماتا جاتا ہے۔ اس کی رنگینی مکر و فریب، حرص و آز، غیض و غضب، حسد، خوشامد، غیبت، فتنہ پردازی غرض دُنیا جہان کی برائیوں کا جال

پھیلاتی ہے اور اپنے ازلی قول کے عہد سے کوسوں دور بلکہ سخت انحراف کرتی جاتی ہے
کاش اس ہستی موہوم کو ہم سمجھتے لیکن انسانی عقل محدود ہے اور اس غیر محدود دانش کے
سربستہ رازوں کو کب جان سکتی ہے۔ تم نے گلستاں میں سوداگر اور شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی
دلچسپ گفتگو پڑھی ہوگی۔ اس سے زیادہ کیا بیان کیا جاسکتا ہے

افکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد — دنیا کرتی ہے آدمی کو برباد
عقبیٰ کا تصور اور اللہ کی یاد — دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی

اس آئینۂ باطل نے دھوکے کی ٹٹی ایسی سامنے کردی ہے کہ ہم اپنی صورت دیکھتے
ہیں مگر نہیں پہچانتے۔ اللہ رے میلانِ خام اُف رے محویت بے سود۔ خدایا سنگ مراد
بھیجدے جو اس آبگینۂ غفلت کو چور چور کردے اور ہمکو وہ محویت عطا کر جس کو تم ہی خوب جانتا ہے

تغافلت کردپائمالم چہ ساں نگریم چرا نالم
فراشیہاے رنگ حالم فراشت یادمی نگارم

ابتدائے عالم سے آج تک جو کچھ اس زمین پر ہوا اور جو جو حالتیں اور انقلاب گذرے
وہ چشم فلک سے پوشیدہ نہیں۔ اُس نے دیکھا ہوگا کہ پہلے انسانوں اور حیوانوں میں کوئی
بڑا فرق نہیں تھا۔ وہ جاہل تھے اور بالکل وحشی درندوں کا نمونہ پیش کرنے والے انسانوں
کا قتل کرنا اُن کے لئے ایک دلچسپ کھیل تھا اور اپنی جہالت کے شعلوں سے گروہ کے گروہ
جلاکر خاک سیاہ کرڈالتے تھے۔ تفریح طبع کے لئے جنگ وجدل فتنہ وفساد کی آگ میں کود پڑتے
تھے۔ آسائش وآرام مفقود تھا۔ طرز معاشرت میں ظلم وستم روا تصور کیا جاتا تھا مطلب برآری
اور حصول مدعا کے لئے جتنی نئی چیزیں اُن کی نظروں سے گذرتی تھیں وہ ان کو معبود حقیقی خیال کرکے
ان کی پرستش کیا کرتے تھے لیکن اُس خالق ارض وسما نے متعدد رسل وپیغامبر دنیا میں بھیجے تاکہ اُن کو راہ راست
پر لائیں۔ اُن کو زمانہ کے موافق حالاتِ دنیوی کے مطابق چند ضروری امور سمجھائیں۔ چند آسان اصول
معاشرت بتلائیں تاکہ وہ ان پر عمل پیرا ہوکر اپنی سیاہ اعمالیوں سے رفتہ رفتہ نجات حاصل کریں۔

ان نفوس قدسیہ نے باوجود جھٹلائے جانے تکالیف و رنج اٹھانے کے اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں کوتاہی نہ کی۔ بلکہ بہانگ دہل پکار پکار کر گمراہوں کو قعر لعنت وضلالت سے بچایا اور آخر وقت تک رب العزت کی طرف صدائے دعوت حق بلند کرتے رہے۔

وہ لوگ جنھوں نے اُن نفوس قدسیہ کو جھٹلایا، ان کے احکام پر عمل نہ کیا، ان کی نصیحتوں کو نہ مانا وہ اس دُنیائے فانی میں گمراہ رہے۔ اپنی بے پروائیوں سے اور بد کرداریوں سے شرف انسانیت کی منور پیشانی پر کلنگ کا ٹیکہ لگایا۔ بس مُردن بھی جامۂ فسق و فجور پہنے چلے گئے۔ جن لوگوں نے ان کی تعلیم کی برکات اور اُن کے اخلاق حمیدہ و ستودہ صفات سے استفادہ حاصل کیا وہ دارین میں نیکنام کہلائے اور دنیا و آخرت کے سفر نہایت آسانی و آرام سے طے کئے۔ اُس ذوالجلال کا ہزار ہزار شکر ہے کہ وہ انسان کی نافرمانیوں پر رحمت کے بادل برسانا رہتا ہے۔ اس کی سرکشی اور تکبیر کا کچھ خیال نہیں کرتا۔ بلکہ مہربان باپ کی طرح آغوش لطف وکرم میں لینے کے لئے ہر لحظہ تیار رہتا ہے۔ افسوس اس انسان پر جو نفس امارہ کی راہنمائی پر عبادت کو ٹھکرا کر، خودستائی اور خودنمائی کا جامہ زیب تن کئے ہوئے ناشکرگذاری کا راستہ اختیار کئے ہوئے، بغض، کینہ، حسد، مکروفریب کی امداد سے منزل حیات کو طے کرنے کے خیال میں اس قدر مستغرق اور از خود رفتہ ہوا جاتا ہے کہ اس مالک حقیقی کی عطا کی ہوئی چیزوں کا بھول کر بھی شکریہ ادا نہیں کرتا جس کو عدیم الفرصتی کی ناجائز دلیل پر محمول کرتا ہے۔

حیف ہے اس ناہنجار ناپاک انسان پر جو زرپرستی کے طوفان خیز سمندروں میں خون ناحق کی موجزن لہروں پر کشتی حیات پر سوار نفس امارہ جیسے ناخدا کی رہنمائی میں باد حق کی مخالفت پر تلا ہوا چلا جارہا ہے۔ شاید یہ اس وقت تک بیدار نہ ہوگا جب تک یہ طوفان بے تمیزی کے تلاطم خیز بھنوروں میں گھری ہوئی کشتی موت کے گھاٹ نہ اتار لی جائے۔ اے تکبر و نخوت کے پتلے تو آج جو اترایا ہوا زمین کی چھاتی کا بوجھ بنا ہوا اپنی نخوت کی مونگ دلتا پھرتا ہے، کیا تجھے فرعون و نمرود جیسے سرکشوں کے واقعات یاد نہیں۔

اے ناشکر، ناسپاس، غافل انسان تو زمانہ کی دولت و ثروت پر جو امتحاناً تجھے اس رحیم و کریم نے

عطا کی ہے فخر و ناز کرتا ہے اور اس کی بارگاہ کی چوکھٹ پر حق عبدیت ادا کرنے میں پس و پیش کرتا ہوا جبین نیاز رگڑتے ہوے شرماتا اور عار کرتا ہے۔ کیا تو یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی ذات تیرے ان حرکات کی محتاج ہے! نہیں ہرگز نہیں! بلکہ وہ چاہے تو آن واحد میں تجھے بنا دے یا بگاڑ دے کیونکہ وہ تیرے مال و متاع پر، تیری جان پر، تیری عزت پر کامل قدرت رکھتا ہے۔ اے متکبر و سرکش انسان تو آج جو خوش ہے اور رنج و محن سے اپنے کو آزاد خیال کرتا ہے کیا یہ نہیں سمجھتا کہ اگر تیری بدکاریاں اور نافرمانیاں اُس قادر مطلق کے قہر کو گرما دیں تو تیری شان و شوکت، دولت و راحت کا نشہ دیکھتے دیکھتے کافور ہو جائے گا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ یہ پیر فلک سینکڑوں وصال جدائی سے، سہاگ سوگ سے، عیش غم سے اور راحت تکلیف سے بدل دیتا ہے؟ اُس مالک ارض و سما کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ وہ آج جس کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی دیتا ہے کل اس کو حکومت کی مسند پر بٹھاتا ہے۔ وہ ہستیاں جو ذلیل و خوار پھرتی ہیں ان کی عزت و حرمت اور دولت کا وہی نگہبان ہوتا ہے۔ جو ذلیل و مفلس نظر آتے ہیں وہ پھر صاحب اقتدار کر دئے جاتے ہیں۔ اے ریاکار و مکار انسان شاید تو ان علائق دنیوی کے رازوں کو جانتا نہیں اگر جانتا بھی ہے تو دیدہ و دانستہ خیال میں نہیں لاتا۔ یا تو بے خبر اور جاہل ہے کیونکہ تجھے آنکھیں تو دی گئی ہیں مگر ان میں نور بصارت معدوم ہے ہاتھ پاؤں رکھتا ہے مگر انہیں کارہائے کبر و نخوت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ تیری رگوں میں خون ہے مگر اُس کا دوران صرف خود غرضی، بداعمالی، نفسانیت کے لئے محدود کر رکھا ہے۔ اگر تو دنیا کی بدبختیوں، بداعمالیوں، رنج و محن، تکالیف وغیرہ کے رازوں سے واقف ہوتا تو افعال قبیح تجھ سے سرزد نہیں ہوتے جن کا تو آجکل پتلا بنا ہوا ہے

کی طاعت نفس میں بہت عمر بسر انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیت شب اُٹھا چکے اب جاگی مجلس کرو برخاست ہوا وقت سحر

وہ اعلیٰ احساسات و جذبات جو ازل سے تیرے وجود میں پیدا کئے گئے ہیں تو محض ان کو اپنی سرکشی سے ٹھکرا کر ان کے فوائد سے خود بھی بے بہرہ بنا ہوا ہے اور دوسروں کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ ایسی سرکشی ایسی لاابالی حالت والے انسان تو اپنے وعدہ اور جملہ فرائض و حقوق انسانی کو فراموش کرنے کے بعد بقائے دوام

کا خواہاں نظر آتا ہے، جس کا ہر گز تو مستحق نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تو اپنا رخت ہستی باندھ لے ؎

منزل ہے بعید باندھ لو زادِ سفر — مواج ہے بحر رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے۔ لے چلو مال کھرا — ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہ گذر

(حالیؔ)

محی الدین احمد قریشی

غزل

میر آفتاب علی خاں صاحب قہر

اس طرح کی شوخیاں گر آپ کرتے جائیں گے — مرنے والے موت سے پہلے ہی مرتے جائیں گے
کرنے والے حشر تک اپنی ہی کرتے جائیں گے — وہ جلاتے جائیں ہم ہر روز مرتے جائیں گے
وعدۂ فردا کبھی پورا بھی ہو گا یا نہیں — عمر کٹتی جائے گی اور دن گزرتے جائیں گے
کچھ نہ اپنوں سے شکایت ہے نہ غیروں سے گلا — اپنی قسمت کی جو بھرنی ہے وہ بھرتے جائیں گے
حُسن تو وہ حسن ہے جس کا بگڑنا ہے بناؤ — زلف اُلجھتی جائے گی جتنی۔ سنورتے جائیں گے
لٹنے والے دل کے بھولیں گے نہ تیری یاد کو — بستیاں اجڑی ہوئی آباد کرتے جائیں گے
چاہنے والے چھپائیں لاکھ اپنا دردِ عشق — رنگ اُڑتے جائیں گے چہرے اُترتے جائیں گے
حشر میں خاموش جانے سے بھلا کیا فائدہ — تم ستاتے جاؤ ہم فریاد کرتے جائیں گے
اس سے بہتر چاہنے والوں کا کیا ہو مشغلہ — وہ ہمیں بھولیں۔ ہم ان کو یاد کرتے جائیں گے
عیب چھپنے پر بھی آخر عیب ہی رہ جائیں گے — داغ بنتے جائیں گے جو زخم بھرتے جائیں گے
امتحاں منظور ہے میری محبّت کا جو قہر — ذبح کرتے جائیں گے کچھ کچھ ٹھہرتے جائیں گے

سزا

تاریخ متقدمین کا مطالعہ کیجئیگا تو معلوم ہوگا کہ سزا کا رواج نہایت قدیم ہے، کیونکہ قدیم متمدن

اقوام میں یہ رسم موجود تھی۔ لیکن سزا جس مقصد اور جس ارادہ سے دی جاتی رہی ہے وہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایک نہیں رہی۔ اس نقطہ نظر سے سزا کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے۔

اہلِ یونان ابتدائی زمانہ میں جرم کے اثر کو صرف اُس شخص کی ذات تک یا اُس کے خاندان تک محدود سمجھتے تھے جسے نقصان پہنچا ہو، یعنی اگر ایک شخص دوسرے کو ضرر پہنچائے تو ہیئتِ اجتماعی یا سلطنت کو اس میں دخل دینے کا نہ اختیار تھا نہ خواہش۔ جسے نقصان پہنچا ہے اُسی کا فرض ہے کہ مجرم سے اپنے نقصان کی تلافی حاصل کرے۔ اگر قتل کا معاملہ ہو تو مقتول کے وارث قاتل کو مار ڈالیں یا معاف کر دیں۔ تمام قدیم اقوام کے ابتدائی مدارجِ ارتقاء میں سزا کا یہی اُصول رہا ہے۔

جب یونان کا نظام الاصنام کسی قدر وسیع ہوا تو سزا مذہب کے زیرِ اثر ہوگئی۔ جرم دیوتاؤں کے غضب کا باعث تصور کیا جانے لگا اور جمعیت میں اک مجرم کی موجودگی ناپاک سمجھی جانے لگی۔ اس لئے ہیئتِ اجتماعی کا یہ فرض ہوا کہ مجرم سے مضرور کو معاوضہ دلوانے کے علاوہ اُسے جرم کی گندگی سے پاک کرے۔ اس قسم کے تزکیہ کے لئے ایتھنز میں مجلس اریوپیگس مقرر تھی۔ یہ مجلس مجرم کو پاک کرکے ایری نیس (دیویاں) کی تسکین کرتی تھی اور ابتدائی تخیل میں یہ ایری نیس کچھ نہیں حقیقت مگر مقتول اشخاص کی انتقام طلب روحیں، جنھیں اصنام سازی کے ذوق نے دیویاں بنا دیا تھا۔

انگلستان میں اینگلو سیکسن زمانہ میں ہر شخص کی جان کا ایک معاوضہ (ور جلڈ) مقرر ہوتا تھا اور اُس کے قتل ہونے پر قاتل کو وہ ورجلڈ ادا کرنا پڑتا تھا لیکن اس نظام معاوضہ کے باوجود، اس خیال کو بھی رواج حاصل تھا کہ جرم کا اثر ہیئتِ اجتماعی پر بھی پڑتا ہے۔ اور یہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں اُس زمانہ میں اک رسم تھی کہ اگر عوام میں سے بعض اشخاص حلفیہ یہ کہدیں کہ مجرم نے جرم نہیں کیا تو وہ رہا کر دیا جاتا تھا۔

یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں تصدیقِ جرم کے دو عجیب طریقے رائج تھے۔ ان میں سے ایک "آرڈیل"، یعنی طریقۂ ابتلا تھا۔ مجرم گرم سرخ لوہے کو اپنے ہاتھ میں لیتا تھا یا وہ گرم پانی میں ڈبویا جاتا تھا اُسے اِک خاص مقدار میں زہر کھلایا جاتا تھا۔ اگر وہ اس آزمائش کا مقابلہ کامیابی سے کرلیتا تو

رہا کر دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ تصدیق و سزا کا یہ طریقہ کس قدر غیر فطری تھا، اور بہت کم ایسے خوش نصیب لوگ ہوتے ہوں گے جو اس طریقہ سے اپنے بے گناہ ہونے کا ثبوت دے سکتے ہوں۔ سنہ ۱۲۱۸ء میں انگلستان میں آرڈیل کی ممانعت کر دی گئی۔

مقدموں کے فیصلہ کرنے کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ دو اشخاص میں باہم جنگ ہوتی تھی اور مقتول مجرم سمجھا جاتا تھا۔ اس طریقہ کی ابتدا فرانس کے زمانۂ شجاعت (شولری) میں ہوئی تھی اور زمانۂ حال تک وہاں یہ طریقہ ایک خطرناک صورت میں موجود رہا ہے۔ انگلستان میں اس کا رواج جارج سوم کے زمانہ تک رہا۔ ڈیوک آف ولینگٹن نے لارڈ ونچلسی سے سنہ ۱۸۲۹ء میں اس قسم کی جنگ کی تھی اور باوصف اس کے کہ تمام دنیا کی اقوام میں اس کی قانوناً ممانعت ہے، آجکل بھی اس کی مثالیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور یورپ کی ممتاز زبانوں کے لٹریچر میں اس رسم نے الفاظ کی ایک کثیر تعداد کا اضافہ کیا ہے۔ اس عجیب رسم کی بنا پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی قدر تو جذبۂ انتقام پر مبنی ہے اور کسی قدر اس خیال پر کہ قدرت بے گناہ کو، خواہ وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو، مجرم پر فتح یاب کرتی ہے۔

زمانۂ حال میں سزا کا فرض ہیئتِ اجتماعی اور سلطنت پر ہے یعنی یہ نظریہ کامل طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ جرم کی وسعتِ اثر میں نہ صرف مضرور بلکہ پورا نظامِ اجتماعی بھی شامل ہے۔ اس لئے ایک جرم کسی خاص فرد کے خلاف ہونے کے علاوہ سلطنت کے بھی خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مضرور کی درخواست کے بغیر پولیس کا فرض ہے کہ مجرم کو، تصدیق کے بعد، سزا دینے کا بندوبست کرے۔

سزا کے مختلف ذریعہ رائج ہیں۔ بعض جگہ قصاص یا پھانسی مجمع عوام کے سامنے دی جاتی ہے اور اس کا مقصد عبرت ہوتا ہے۔ جرمانہ یا قید سے یہ مقصود ہے کہ مجرم کو کسی نقصان یا تکلیف کا احساس ہو اور وہ دوبارہ ارتکابِ جرم سے باز رہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے "کیا سزا مجرم کی اصلاح کر سکتی ہے اور اُسے آئندہ ارتکابِ جرم سے باز رکھ سکتی ہے؟ جرم کی وجہ پر غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ جرم کے عموماً تین اسباب ہیں۔

(۱) ارادہ

(۲) نقصِ نسل۔ جس طرح اور خصوصیات نسلی ہوتی ہیں، اسی طرح خواہشِ جرم بھی بعض حالتوں میں پیدائشی ہوتی ہے۔ اور اس لئے بعض نسلیں فطرۃً جرم پسند ہوتی ہیں اور اُن میں جرم کی کوئی خاص صورت طبعی طور پر موجود رہتی ہے۔ اسی وجہ سے مجرم کی شناخت اکثر اوقات اُس کے قیافہ سے اور جسمانی ساخت سے ہوسکتی ہے، مثلاً اکثر قاتل کے ہاتھ چھوٹے اور چور کے لمبے ہوتے ہیں۔

(۳) اثر ماحول۔ اک انسان جس ماحول، جس نظامِ اجتماعی اور جس جغرافیائی حالت کے زیرِ اثر نشو و نما پاتا ہے، اُس کا بھی اُس کے اخلاق و عادات پر نہایت نمایاں اثر ہوتا ہے۔ مثلاً پہاڑی لوگ جاہل اور جلد غصّہ میں آجانے والے ہوتے ہیں۔ لسباس کے غیر معصوم میعارِ زندگی کی وجہ وہاں کی زرخیز اور راحت آگیں جغرافیائی حالت تھی اور وہ نظامِ اجتماعی، جس میں اُن کے طبقۂ نسواں کو اک خطرناک آزادی حاصل تھی۔

غرض مجرم جرم کا اُسی حد تک ذمّہ دار ہے جس حد تک اُس میں اُس کا ارادہ شامل ہے۔ بعض اوقات نقصِ عقل کی وجہ سے وہ اپنے ارادہ کا بھی ذمّہ دار نہیں ہوتا۔ تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض مجرموں میں قوتِ تمیز بالکل مفقود ہوتی ہے۔ اس لئے یہ نظریہ کہ جرم کی وجہ ناواقفیت ہے خواہ وہ کسی قسم کی ہو، اک حد تک درست ہے۔

پس اگر مجرم کی اصلاح اور جرم کا انسداد منظور ہے تو سزا کی بجائے معالجانہ طریقہ اختیار کئے جائیں اور مجرم کو پولیس کی نگاہ سے نہیں بلکہ اک ماہرِ سائنس اور اک ڈاکٹر کی نظر سے دیکھا جائے۔ ایسی تدابیر استعمال کی جائیں جن سے مذکورۂ بالا اسباب جرم کا انسداد ہو جائے۔ مجرموں کو جیل خانہ میں قید رکھنے کی بجائے، اُن کے جسمانی، عقلی اور ذہنی امراض کا علاج کیا جائے۔ شراب اور دیگر مسکرات کے استعمال کی ممانعت کر دی جائے، کیونکہ مسکرات کی وجہ سے عصبی کمزوری پیدا ہوتی ہے، اور اک ایسا شخص جس کے اعصاب کمزور ہوں اور نظامِ عصبی مختل ہو اپنی حرکات نفسانی کا مالک نہیں ہوتا اور جوشِ غضب یا جوشِ خواہش میں جرم کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ غیر معصوم اور بیہودہ

رسوم کی خواہ وہ معاشرت سے متعلق ہوں خواہ اُنہیں مذہبی ملبوس میں زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہو ممانعت کی جائے۔ اور تعلیم، اخبار، رسائل اور کتب پر اک نہایت شدید پابندی اس احتیاط کی لازم کردی جائے کہ اُن کے ذریعہ سے پُر مکر و ریا، حیاسوز، مخربِ خیال اور اخلاق شکن لٹریچر ملک میں شائع نہ ہو سکے۔

اڈیٹر

فنونِ لطیفہ

نقّاشی و مجسمہ سازی

فنونِ لطیفہ کا ایک مقبول عام مفہوم ایک ایسے منظر یا فضا کی تعبیر ہوتی ہے جو مصوّر کی نظروں سے گذرا ہو۔ یا کسی گذشتہ واقعہ کا اس طرح ظاہر کرنا ہوتا ہے، جو ناظرین کو بھلا معلوم ہو اور بدیں وجہ مستحق تحمید و ستائش سمجھا جاے۔ یہ فنونِ لطیفہ کے صحیح معنیٰ نہیں۔ فنونِ لطیفہ کی آماجگاہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہوتی ہے اور ان کا مطمح نظر محض ایک خوشگوار معائنہ نظری سے بدرجہا مرتفع اور پاکیزہ ہوتا ہے۔ جب فنونِ لطیفہ سے صرف مذکورۂ بالا معنیٰ لئے جاتے ہیں تو وہ فنونِ لطیفہ نہیں بلکہ سراب یا ایک فریب نظر ہوا اور فی الحقیقت اگر اس کو "فنونِ خسیسہ" (Mechanical Arts) کے نام سے موسوم کیا جاے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ اس حقیقت نفس الامری کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ہر اُس شئے کو جو نظروں سے گذرے صرف منقول یا مرتسم کردینا خواہ وہ کتنی ہی خوبی اور نزاکت سے کیا گیا ہو نہ تو فنونِ لطیفہ کے صحیح معنیٰ ہیں اور نہ مقصد۔ سر الفریڈ ایسٹ نے خوب کہا ہے کہ "کوئی شخص (یعنے ایک حقیقی مصوّر) نیچر (موجودات اور مخلوقات) کو علیٰ حالہٖ منقوش کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لاے گا"۔ مصوّر کو چاہیئے کہ وہ کارخانۂ قدرت کا کھلی آنکھوں اور کھلے دل سے مشاہدہ کرے اور اس سے مشترک الحس ہوکر، اگر وہ ایک نقّاش ہے تو اپنی تصویر میں اپنے احساسات اور جذبات کو اس طرح ظاہر کرے کہ خود تصویر بول اُٹھے اور ناظرین کو بھی

اُنہیں جذبات اور ہمدردی سے معمور اور ہخیالی وہم طبعی سے متاثر کر دے جو نقش کھینچتے وقت مصوّر کے تخیل میں موجزن اور دل و دماغ پر مستولی تھے اور جس کی بنا پر اُس کا تخیل بندھا تھا۔ فنون لطیفہ کی تمام تر غرض و غایت یہ ہے کہ وہ ایک مصوّر کے جذبات کی مختلف ذرائع کی وساطت سے ترسیم و تعبیر کر سکیں۔

مصوّر کبھی تو نیچر میں مختلف روشنیوں کو دیکھتا ہے اور ان روشنیوں کو کرچ (canvas) پر رنگہائے بوقلموں کے ذریعہ اور اپنے دست پُر تیقّن کی رہنمائی اور قلم کی جنبش سے اس طرح چمکا دیتا ہے جیسے کہ خورشید عالم تاب کی شعاعیں فطرت میں نظر آتی ہیں اور اسی طرح ضیا بخشی کو گرمی کی ردیف قرار دیتا ہے جس سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو نور اور دل و دماغ کو گرمی اور تقویت اور روح کو لذّت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی فنون لطیفہ کا منتہا سے مراد ہوتا ہے کبھی وہ ایک بت خاموش کے چہرے میں اُن مختلف جذبات کو جس کا صرف اس کی تیز نگاہ نے باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے مجتمع کر دیتا ہے، بدیں غایت کہ وہ جذبات اور خوبیاں جن سے اُس نے خود استفادہ کیا تھا زینت دہ طاق نسیان نہ ہو جائیں اور ان کے اظہار کی غرض سے اس کا تیشہ ایک کالبد بے جان کو حیاتِ جاوید کا جامہ پہنا دیتا ہے تاکہ وہ آئندہ نسلوں میں تازہ روح پھونکے، ان سے مشتل الحس ہو سکے، ان کی ناکامیاں اور رنج و آلام میں دستگیری کرے اور ان کی خوشیوں اور کامیابیوں پر مفتخر و نازاں بنائے جیسے کہ حسن خداداد کا اثر دل کو بے اختیار کر دیتا ہے اور دیکھنے والا مبہوت ہو جاتا ہے گویا کہ ایک سکتہ کے عالم میں ہے۔ اسی طرح تیشہ کی وہ چوٹیں جو ایک بت کو متشکل اور سڈول بنا لیتی ہیں اور اس کے خط و خال نمایاں کرتی ہیں اور اس کے جذبات کو اس میں زندہ کر دیتی ہیں ایک ظالم کے دل پر اثر کرتی اور اس کے مذموم منصوبوں کو خداترسی سے مبدل اور نیکی سے بہرہ ور کر دیتی ہیں۔ ایک طفل معصوم کی شبیہ جس کی نگاہیں دُنیا کی نیرنگیوں اور اس کی حقّہ بازیوں کو اور انسان کی خود فراموشیوں کو عالم خاموشی میں مشاہدہ کرتی چلی آئی ہیں اور

جس کے چہرہ پر ایک گونہ ہمدردی، اور تبسم کے کیف و آثار نمایاں ہوگئے ہیں کئی تاریک دلوں کو منور اور کئی پست ہمتوں کو مرتفع کرسکتی ہے۔ اور بے ناموس اور ننگ اور تباہی کی راہ سے لوٹا کر بالآخر ظفر و نصرت اور عزو وقار کی مستحسن شاہ راہ پر لگا سکتی ہے۔

فنِ لطیف اس کو کہتے ہیں۔ اور جو صنف فنونِ لطیفہ کی اس معیار میں پوری نہ اُترے اور اس مقصد اور نصب العین کو (یعنے براہ راست دل سے تکلم کرنے کو) انجام نہ دے فنونِ لطیفہ سے نہیں ہے۔ اس سے اسی طرح احتراز کرنا چاہیئے جیسے کہ ایک بلائے بیدرماں سے ورنہ بسبب عدمِ احتیاط و تحفظ بجائے مبدءِ فیض ہونے کے وہ انسان پر قابض اور حالت بیخودی میں اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوجائے گی اور اس کے خیالات کو گندہ اور حوصلوں کو مسمار کرکے اس کی ایک عظیم اور لاعلاج گمراہی ضلالت اور تباہی، اتلافِ نفس کا باعث اور موجب خسران ہوجائے گی۔ فنون لطیفہ کے مذکورۂ بالا حسن کی تعیین صرف خطوط کی نزاکت اور خاکہ کی صحت یا رنگوں کی لامیعت سے نہیں ہوسکتی بلکہ ترکیب اجزائی کی نفاست اور پاکیزگی سے یا یوں کہئے کہ مصور کے اس "خونِ جگر" کی مقدار سے جو کہ بوقتِ تشکیل یا صورت پذیرائی اس میں مشتمل رہا ہے اور اُس وسعت معلومات سے جو دل و دماغ کو تصویر یا مجسمہ کی تاثیر سے حاصل ہوتی ہے۔

سید محمد جعفر

آلیور کرامول

ہر فرعونے را موسے

یہ فارسی زبان کا ایک مشہور مقولہ اور معروف ضرب المثل ہے اور کہنے والے نے اس میں سچ اس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ اُس پر سو دل سے قربان اور ہزار جان سے صدقے ہونے کو جی چاہتا ہے۔ یوں تو آدمی کی بساط ہی کیا ہے مگر یہ یاد رہے کہ حضرت انسان وہ ہستی ہیں جن کی شان میں ربِّ جلیل کا فرشتوں سے ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم نے آدم کو جو سکھایا ہے وہ تم نہیں جانتے

یعنی جو کچھ بھی خدا وند کریم کو اپنی مخلوق کو سمجھانا اور سکھلانا تھا وہ انسان ہی کو سکھا پڑھا دیا۔ غرض تمام مخلوقات میں انسان ممتاز اور سرافراز ہے۔ کیوں نہ ہو آخر اشرف المخلوقات ہے۔ اس کا علم مخلوقات عالم سے بالاتر ہے۔ لہذا علم انسانی پر اگر ابتدائے آفرینش سے ایک گہری نظر ڈالی جائے اور تاریخ غور سے پڑھی جائے تو یہ امر مثل روز روشن واضح ہو جائے گا کہ اس عجیب کہاوت میں جھوٹ کو ذرا سا دخل نہیں ہے۔ اپنے مضمون کے فرعون اور موسیٰ کے لئے ہمیں انگلستان کی تاریخ کی سیر کرنی ہوگی ہمارا فرعون انگلستان کا بادشاہ چارلس اوّل (Charles I.) اور ہمارا موسیٰ ہنٹنگڈن شائر کا آلیور کراموِل (Oliver Cromwell) ہے۔

اس پر مفصل اور محققانہ بحث کرنے کے لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم پہلے انگلستان اور یورپ کی تاریخ پر اور اس کے مذہبی اور سیاسی حالات پر ایک سرسری نظر ڈالیں ۱۴۸۵ء میں انگلستان نے وارز آف دی روزز (Wars of the Roses.) کی خوفناک اور تباہ کن خانہ جنگی سے بیزار ہو کر ہنری ٹوڈر (Henry Tudor.) کی سخت حکومت کو رحمت اس کے ظلم و ستم کو رحم و کرم اور اس کے جور و تعدی کو مخلصی اور چھٹکارا سمجھ کر بسر و چشم قبول کر لیا اور خانہ جنگیوں نے (۳۰) سال سے مسلسل ملک کو ویران اور برباد کر رکھا تھا۔ امرا اور پارلیمنٹ کی حکومت کا مزہ قوم نے ایسا چکھا کہ اس کو پھر کبھی نہ بھولا۔ اڈورڈ سوم (Edward III.) کی تخت نشینی سے رچرڈ دوم (Richard II.) کی معزولی تک اور پھر ہنری ششم (Henry VI) کے انتقال تک یعنی ۱۳۲۷ء سے ۱۴۵۳ء تک فرانس (France) اور انگلینڈ (England) میں وہ جنگ ہوتی رہی کہ عیاذاً باللہ۔ کبھی یہ اُن پر فتح پاتے اور کبھی وہ اُن پر اور اس جنگ میں جسے ہنڈرڈ ییرز وار (Hundred years war) جنگ صد سالہ کہتے ہیں دونوں طرف سے بڑے وحشیانہ حملے کئے گئے۔ اس جنگ کی بدولت فرانس اور انگلینڈ میں اس بلا کی نفرت پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کی متعدد کوششیں اور جان توڑ محنتیں

اتفاق پیدا کرنے سے قاصر رہیں۔

ابھی فرانس سے لڑائیوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہونے پایا تھا کہ ۱۴۵۵ء میں جنگ "وارز آف دی روزز" (Wars of the Roses) شروع ہو گئی۔ تمام ملک دو گروہ میں تقسیم ہو گیا امرا کبھی ایک خاندان کی طرف داری کرتے اور کبھی دوسرے کی۔ ہر جاگیر میں ایک قلعہ تھا اور ہر ایسے قلعہ میں اُس جگہ کا جاگیر دار حکومت کرتا تھا۔ اس کا حکم قانون تھا اور اس کا اشارہ آئین۔ ہر ایک گھر ٹکسال بنا ہوا تھا۔ گلی گلی لڑائی جھگڑے برپا تھے۔ تجارت تباہ، زراعت برباد اور صنعت بند تھی۔ غرض امن وامان کے زمانہ میں جو کچھ کاروبار ہو سکتا ہے وہ سب بالکل بند تھا اخلاقی اور مذہبی حالت اس سے کہیں زیادہ ابتر تھی۔ جو خانقاہیں اور مذہبی زاویہ زمانۂ اولین میں تعلیم وتربیت کے منبع اور تمدن وتہذیب کے سرچشمہ تھے، وہ اب شراب خانے اور جہالت کے گھر بنے ہوئے تھے۔ راہب اور پادری سوا دنیوی امور کے خدا کا نام تک نہیں جانتے تھے۔

(باقی آئندہ)

اے چاند

(نظم معرا)

اے ضیائے منجمد، اے معدن حسن وجمال
گرچہ عالم گیر ہے تیرا جمال اور بے نقاب
تیری محفل کا اثر مسکر ہے اے ماہِ منیر
یا یہ لہریں سعی کرتی ہیں کہ وہ چپ سو رہے
زائر معصوم! اے سیاح حسیں! سچ سچ بتا
آہ! مطلوب حقیقی کی تو خود تو ہے دلیل
کاش میں ہوتا مکیں تیرے کرہ کا ماہتاب!
کاش میں ہوتا وہ چھوٹا سا ستارہ تیرے پاس
میرے ہذیاں سہی تو بہتر ہے ترا فرض جمیل

اے جبین آسماں اے ماہتاب نور پاش
ذرہ ذرہ میں ترے ہے ایک دنیائے حیا۔
روشنی میں تیری پوشیدہ ہے اک جذب سرور
اور اُس کا طفل آسا بڑھ رہا ہے اضطراب
کس لیے پھرتا ہے تو؟ کس شے کی ہے تجھ کو تلاش
تیری ہستی اُس کی صنعت کا ہے اک نقش حسیں
اور فضا ارض میں ہوتا میں تیرا ہمسفر
اور تیری بزم کا ہوتا میں اک جزو حقیر
کام میں مشغول ہو جاتے طواف زمیں

آسماں لے ابر اور سو رہی ہے کائنات
ہے تری بزم حسیں کی کیفیت اُمید فزا
عکس پانی پر ترا یہ جل رہا ہے یا سفینے
عصمت دوشیزہ ہے گویا نہ تیری شکل
آسماں کے نیل میں اک عجلت خاموش سی
اُس کی حمد و وصف کی ہیں ظاہر تیرے روش خوش
اپنے بربط اور نغموں سے کہیں تیری خستگی
وقت تیرا ایک پا تو نہ کہیں ضائع ہو

دیکھنے والا ترا میرے سوا کوئی نہیں
نرم کر دیتی ہے دل کو تیری شرمیلی ضیا۔
جھیل کی لہریں ہیں اسکے ساتھ مصروف لعب
رقص موسیقی کا تیری چال ہے اک اتحاد
تیری کشتی جا رہی ہے کس کنارے کی طرف
صفحۂ افلاک پر افراد تیری بزم کے
کر دیا کرتا مبدل تازگی وجوش سے
دیر سے ہے تو مرے نغمات کا یا جگنو

(ایڈیٹر)

اخبارِ علمیہ

دنیا کے سائنس نے جو ترقی کی ہے اور جو نئی نئی چیزیں انسانی محنت و تخیل کا نتیجہ ہیں اس کا علم ہمارے ہم مشربوں میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ بہت سی نو ایجاد چیزوں کا تصور ہمارا ذہن نہیں کر سکتا اور کچھ اس لئے کہ ہماری کاہل طبیعت سوچ بچار کی محنت گوارا نہیں کرتی۔ حالانکہ متعدد اخبار اپنی پوری کوشش سے نیند کے ماتوں پر پانی چھڑک رہے ہیں اور شاہراہ ترقی کی طرف بلا رہے ہیں مگر ہماری بند آنکھیں نور کی رحمت سے ابھی تک ناآشنا اور اس کی لذت سے محروم ہیں۔ اب جبکہ علم کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے اور نئے معلومات بہت آسانی سے دستیاب ہوتے ہیں ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے دینا سب سے زیادہ پستی اور نکبت کی دلیل ہے۔ امید ہے کہ ناظرین چند دلچسپ واقعات کے پڑھنے کو اپنا وقت گنوانا نہ سمجھینگے اور یوں دائرۂ علمی کو وسعت دیں گے (کاش ہم لوگ گوش بر آواز یورپ ہو جائیں اور ترقی کے میدان کو تیزی کے ساتھ ختم کریں)۔

مَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

(۱) سائنس کے ایک ماہر مسٹر سموئیل یوفین نے جو امریکہ میں ایک ممتاز خدمت پر رہ چکے ہیں اپنی اختراعات کا ذکر کرتے کرتے ایک آلہ کا ذکر کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کامل تاریکی میں بھی ہر چیز بآسانی دکھائی دے۔ چنانچہ دریا کی گہرائی کی پوشیدہ چٹان اور شب تار میں طیارے روز روشن کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔

(۲) یہ عجیب بات ہے کہ جب سینما کے فلم تیار کئے جاتے ہیں تو واقعہ کی ترتیب بالکل برعکس کی جاتی ہے مثلاً اگر یہ دکھانا منظور ہو کہ کوئی شخص حوض میں غوطہ لگا رہا ہے تو پہلے ایک ساکن حوض نظر آتا ہے اور پھر اس میں تموج ہوتا ہے۔ پھر اس کے اندر سے دو پیر نکلتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ایک بلندی نمودار ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک انسانی شکل بنجاتی ہے جس کے ہاتھ ایسے اٹھے ہوتے ہیں جیسے کوئی جست کر رہا ہو۔ سینما کے فلم بنانے میں لاکھوں روپیہ صرف کئے جاتے ہیں چنانچہ "دریا کا غوطہ" اور دوسرے کرتب دکھانے میں بہت سی جانیں بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔

(۳) چالیس سال کی ان تھک کوششوں کے بعد امریکہ کے ایک گھڑی ساز ولیم ملفورڈ نے ایک نادر گھڑی بنائی ہے جس میں دس ہزار سال تک ہر سال وماہ ویوم کا پورا پورا حساب معلوم ہوتا رہے گا۔ ماہتاب کی حرکت، طلوع وغروب آفتاب کی گردش بروجی، موسموں کا تغیر وتبدل اور بہت سے مشہور شہروں کا طول البلد اوران کا ٹھیک مقام اس گھڑی سے معلوم ہوتا ہے۔

(۴) برنگھم کے مشہور ڈاکٹر مٹر کنسٹی نے بارہ سال کے مشاہدات کے بعد ایک دوا "ڈیرنیلین" نکالی ہے جو مُردوں کو زندہ کردیتی ہے چنانچہ اُنہوں نے ایک لڑکے کو جو عمل جراحی کے بعد مرچکا تھا اور جس کی قلبی حرکت بند ہوچکی تھی پھر زندہ کردیا۔ یہ دوا انسان کے غدود سے بنائی جاتی ہے مگراس کا اثر پورا ثابت نہیں ہوا ورنہ آج ساری خدائی جاگ پڑتی۔

(۵) مسٹر کیل اسٹوارٹ اطلاع دیتے ہیں کہ انہوں نے لاسلکی ٹیلیفون کے ذریعہ (۱۹۰۰) میل کے فاصلہ پر قومی ترانہ سنا (لاسلکی ٹیلیفون کی قوت کی یہ پہلی مثال ہے)۔

(۶) دنیا کی سب سے قیمتی گھڑی پاپائے روم کے یہاں ہے جس کی قیمت کا اندازہ چھ لاکھ روپیہ کیا جاتا ہے۔

(۷) جاپان اورچین کے متحیر کن قصہ ہمیشہ دلچسپ ہوا کرتے ہیں چنانچہ وہاں کے اشتہارات کا نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے جن کو وہ اپنی جدت کا تمغہ وامتیاز سمجھتے ہیں۔

(۱) ہم پارسل ایسی محبت سے بھیجتے ہیں جس طرح ایک شریف بیوی ایک دورافتادہ شوہر کو۔

(۲) ہمارا ریشم ایسا ہی چکنا اور ملائم ہوتا ہے جیسے معشوق کے گال۔

(۳) مال کے بھیجنے میں ایسی تیزی کرتے ہیں جیسے توپ کا گولہ۔

(۴) خریداروں کے ساتھ ہم ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے دو رقیب ایک معشوق کے ساتھ۔

معین الدین حسین

تبصرہ

اس پرچہ کی اشاعت میں جن حضرات نے امداد دی ہے، ہم اُن کے نہایت ممنون ہیں۔ محی الدین احمد صاحب قریشی متعلم جونیر انٹرمیڈیٹ نے پروف پڑھے اور اس طرح ہمیں ایک خشک اور نہایت دیر طلب کام سے نجات دی۔ خواجہ محمد احمد صاحب متعلم سینیر انٹرمیڈیٹ نے پہلی اشاعت کے متعدد خریدار بنائے۔

"حیوانات کی سمجھ" "کشتۂ نگاہ" "محویت"

وغیرہ افسوس ہے کہ پہلی اشاعت کے لئے منظور نہیں ہوئے۔ "محویت" کی تحریر میں اگر تسلسل ہوتا اور مضمون کے مختلف اجزا باہم تعلق رکھتے تو وہ تحریر ضرور قابلِ اشاعت تھی۔ ہم مضمون نگار صاحب کے رنگین مذاقِ ادب کی تعریف کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آئندہ وہ ہمیں ہر مہینہ مشکور کیا کریں گے۔

محمد احمد صاحب نے کرامول پر ایک نہایت پر از معلومات مضمون لکھنا شروع کیا ہے ہم بخوفِ طوالت کامل مضمون شائع کرنے سے قاصر ہیں لہذا یہ سلسلہ وار چھپتا رہے گا۔ امید ہے کہ انگریزی تاریخ جاننے والے طلبہ اس سے مستفید ہوں گے۔

ہمارے محترم دوست مولوی محمد معین الدین حسین صاحب فاروقی نے "اخبارِ علمیہ" پر خامہ فرسائی کر کے ہمیں ممنون فرمایا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ مستقل طور پر اس سلسلہ کو قائم رکھیں گے۔

نظام کالج میگزین (قدیم) کے لئے یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد کی ایک غزل موصول ہوئی تھی۔ شکر ہے کہ ہم اس مجلہ کے صفحات کو اس سلکِ مروارید سے، جس کا ہر دانہ بجائے خود ایک دُنیائے حسن و تاب ہے، مزین کر سکے ہمیں آپ کی علم دوست طبیعت سے آئندہ ہر قسم کی توقع ہے۔

"نظام انجم" ہمارے کالج کی ایک نہایت محترم و مغتنم ہستی کے عالمانہ قلم کا متبرک نقش ہے
انیس کی لائف کاوش سے لکھی گئی ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ انیس کے کلام پر تنقید بھی اسی تحقیق
کے ساتھ عنایت کی جائے گی۔ "طوفانِ حیات" میں محی الدین احمد صاحب قریشی نے اپنے نقطۂ نظر سے
حیاتِ انسانی پر اک عمدہ اور پرجوش تنقید کی ہے۔ "طوفانِ حیات" کے بعد کی غزل صاحبزادہ میر آفتاب علیخاں
تہر ارشد تلامذۂ حضرت نواب مرزا داغ دہلوی مرحوم کی تراوشِ طبع کا نمونہ ہے۔ جنابِ موصوف کا طلبہ
نظام کالج یا پبلک سے تعارف کرانے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ آپ مختلف وجوہات
کی بنا پر بلدہ میں مشہور رہے ہیں، ایک زمانہ سے آپ نے مشقِ سخن چھوڑ دی تھی اور بزادیہ گمنامی میں
بسر کر رہے تھے۔ مگر اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ کالج میگزین کی خاطر آپ کو فلسفہ "ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ
تنہائی را" کو خیرباد کہنا پڑا۔ انشاءاللہ ناظرین کرام ہر مہینہ التزاماً آپ کے کلامِ نظم و نثر سے محظوظ ہوا کریں گے۔
"فنونِ لطیفہ" ہمارے دوست سید محمد جعفر صاحب کی اک امید افزا اور پاکیزہ کوشش ہے۔
"فلسفۂ شہرت" میں سپیکٹیٹر کے دو تین مضامین کا عمدہ اقتباس کیا گیا ہے۔

تعارف و تمہید کا فرض میرے عزیز دوست مسلم نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ آپ نے
مضامین مہیا کرنے میں بھی بہت محنت کی ہے، لیکن کیا میں اُن سے دوبارہ خواہش کرسکتا ہوں کہ مضامین
کی درخواست اُن حضرات سے کرنی چاہیئے جو مضامین لکھتے ہیں نہ کہ اُن سے جن پر لکھے جاتے ہیں؟!
آپ کی تضمین اک مخصوص منزل کی طرف پہلا اور نہایت امید افزا قدم ہے۔ مجھے توقع ہے کہ
بہت جلد حکیم مومن خاں مرحوم کے اک مقلد سے میں اک عمدہ "مسلسل" نظم لکھوا سکوں گا۔ اک دو منزلہ
مکان کی کھڑکی کے برابر جس میں سے الہامات شعری نازل ہوتے ہیں، اک سرخ لمپ کی روشنی میں
اک دبی ہوئی کرسی پر جو شاعری کے لئے مخصوص ہے، اک سیاہ میز کے کنارے جو بعض اوقات پلنگ
بن جاتا ہے، بعض قیمتی لمحات شاعرانہ غزل گوئی میں صرف ہوتے تھے۔ وہ انشاءاللہ اب
نہایت صحیح طور پر استعمال کیے جائیں گے۔

ایڈیٹر

دیگر ——————

ظہیر احمد
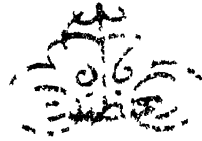
فہرستِ مضامین نظام کالج اردو میگزین بابتہ ماہ ڈسمبر سنہ ۱۹ ء

نشان سلسلہ	مضامین	اسماء مضامین نگار	نمبر صفحہ
۱	۲	۳	۴

۲

ایڈیٹر صاحب نظام کالج میگزین۔

ایک عرصہ سے میں سنتا تھا کہ نظام کالج کے طلباء نے ایک کالج میگزین کی اشاعت کا ارادہ کیا ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اب آپ سے یہ سنکر میں بہت خوش ہوا کہ آپ لوگوں کو اپنی کوشش میں اس حد تک کامیابی ہوئی ہے کہ نومبر ۱۹۲۵ء سے کالج میگزین کی اشاعت کی توقع کیجا سکتی ہے اِس کامیابی پر میں آپ لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ کا کالج میگزین حیدرآباد کے طالب علموں کی علمی اور اخلاقی ترقی میں مدد دے سکیگا اور اُس اہم کام میں حصہ لے سکیگا جو قوم کے نوجوانوں میں اچھے خیالات پھیلانے سے متعلق ہے۔ صدیوں کے تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی تا وقتیکہ اوس کے نوجوانوں کے جذبات پاک اور ہمت بلند نہ ہو۔ اور اون میں اعلیٰ درجہ کے انسانی اوصاف پیدا کرنے کی مسلسل کوشش جاری نہ رہے۔

جو کچھ "علم" انسان نے کتابوں سے یا کسی اور ذریعہ سے حاصل کیا ہو اوس کو روزمرہ زندگی میں "عمل" کی صورت میں ظاہر کرنا اوس کا اہم ترین فرض ہے میں یقین کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کے علم اور ادب کے درمیان ایک واسطہ قایم کرنے کے لئے آپ کا میگزین انشاءاللہ تعالیٰ مفید ثابت ہوگا۔ بشرطیکہ آپ لوگ ہمیشہ اِس امر کو پیش نظر رکھیں اِس عمدہ نتیجہ کے ظہور کا میں منتظر اور آپ کی حقیقی کامیابی اور ترقی کا متوقع رہونگا فقط

نظامت جنگ
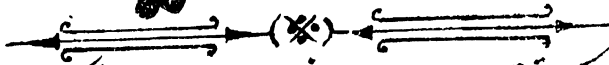
"کسی قوم کی ارتقائے حیات میں معاشی حالات اور ان کے گہرے اثرات کو نظر انداز کردینا اک اہم غلطی کا ارتکاب ہوگا" "بنی نوع کی تاریخ۔ انسان بحیثیت رکن معاشرہ کی تاریخ ہے"۔ گویا اپنے وسیع ترین مفہوم میں معاشی تاریخ ہوئی۔ حیات انسانی کی بقا کا مدار انسان کے روزی کمانے کی قوت اور قابلیت پر ہے اس لحاظ سے معاشی حالات ہی پر سارے شعبات زندگی کا انحصار رہ جاتا ہے۔

"درحقیقت زندگی وہ ہے جو ہیئت اجتماعی سے متعلق ہو" پھر انفرادی حیات نظام اجتماعی کے اندر رہی اندازہ کر متاثر ہوتی ہے۔

"اکثر جرمن فلاسفہ کی اس کوشش کو کہ تاریخ کی معاشی توضیح کیجائے۔ لایعنی تعبیر کرنا اصلیت واقعات کا خون کرنا ہے اس نظریہ سے متعلق منجملہ اور اعتراضات کے ایک یہ بھی ہے کہ ایسی توضیح تاریخ میں روحانی و اخلاقی عناصر کو بالکلیہ فراموش کردیتی ہے"۔ اسکی حیثیت کے جاننے کیلئے ہمارا فرض اولین یہ ہونا چاہیے کہ ہم اساس اخلاق اور اسکی ابتدا میں تمیز کریں۔

تاریخی نقطہ نگاہ سے دیکھیئے تو اس امر کے تسلیم کرنے میں شبہ باقی نہیں رہتا کہ سارے انفرادی اخلاقیات (Indiurdual Ethics.) معاشرتی اثرات کا نتیجہ ہیں اخلاقی افعال دو قسم کے ہوتے ہیں پہلے جنکا اثر دوسرون پر ہوتا ہے دوسرے وہ جن کا ابتدائی اثر صرف ایک شخص کی ذات واحد تک محدود رہتا ہے پہلے عنوان کے تحت ایسے بہت سارے افعال آجائیں گے جن پر آج ہم اخلاقی ہونے کا اطلاق کرتے ہیں۔ اور جنکی

اباحیت اولاً معاشری تھی۔ گناہ یا بداخلاقی کا مفہوم بعد کو وجود میں آیا ہے بلحاظ تاریخ سب سے پہلے ہم جرایم اور اتلاف حقوق کے وجود کو پاتے ہیں یعنی وہ خلاف ورزیان جو معاشرہ کے خلاف اجتماعی طور پر یا ارکان معاشرہ کے خلاف انفرادی طور پر سرزد ہوں ایک مدت گذرنے کے بعد اسکا مفہوم ایسے افعال سے ہو گیا جو خدا یا اس اساس اخلاق کے خلاف جسکی ضمیر گواہی دے سرزد ہوں جب یہ مفہوم ہو گیا تو اسکا حلقہ وسیع ہونے لگا اور اس میں تہذیب ہر کی خلاف ورزیاں داخل ہونے لگیں۔ یہان تک کہ آج جرم و حق تلفی گناہ کے مرادف ہیں حالانکہ تاریخی اعتبار سے اتلاف حقوق اور جرایم سے پہلے گناہ کا مفہوم تسلیم کیا گیا تھا۔ ممکن امکان ہے کہ جارون مین نہ اخلاق کا حسن موجود ہو اور نہ ہی نیکی اور برائی میں تمیز کرنے کا ایک مادہ جانور ممکن ہے کہ جبلت سے اپنے بچے کو اضطراری طور پر ضرر سے بچالے اگر ہم اسکو ہم ایک اخلاقی فعل سے تعبیر کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو کم از کم ایسا مفروضہ قبل از وقت ضرور ہے اس میں شک نہیں یہ فعل بقائے نسل کا ضامن ضرور ہے۔ مگر یہ اخلاقی فعل کہا نہیں جاسکتا بجز اسکے کہ ہم اس بات کے لئے تیار ہو جائیں کہ ہر اس فعل کو خواہ وہ اضطراری ہو یا اختیاری اخلاقی تسلیم کرلین جو بقائے نسل کا باعث ہو۔ "اخلاق" میں ابتداً سودمندی کا مفہوم ضرور موجود ہے مگر یہ لازمی نہیں کہ ہمیشہ سودمندی کا مفہوم اخلاق ہوا کرے۔

اگر ہم جانورون میں اخلاق کے وجود کو ممکن ٹھرائیں تو ماہرین یہہ ہمیں بتادینگے کہ اسکی ارتقا بالکل اسی طرح ہوگی جسطرح انسانون میں ہوئی ہے۔

انسانی سوسایٹی کے وجود میں آنے کے بعد سے ہم یقین کے ساتھہ ارتقا اخلاقی کو دیکھہ سکتے ہیں۔ بعض ان قدیم طبقوں میں جو اب بھی کہیں کہیں وحشت و جاہلیت کی ذلیل ترین منزلون میں پائے جاتے ہیں خلاف ورزیاں صرف وہ افعال ہیں جو قبیلہ یا گروہ کے خلاف اجتماعی طور پر سرزد ہوتے ہیں جنہیں ہم زمانہ حال میں پبلک جرایم سے تعبیر کرینگے غداری زناکاری اور جادوگری یہہ وہ نہایت ابتدائی جرایم ہیں جو ہر جگہہ پائے جاتے ہیں یہ افعال خلاف ورزیان

اسلئے سمجھے گئے کہ یہ ہیت اجتماعی خطرے میں ڈالنے والے تھے اسلئے پہلے جرایم مذکورۂ بالا کے سوا گناہ کا کوئی اور مفہوم نہ تھا۔ "اچھے" یا "بُرے" کے الفاظ ایسے حرکات کیساتھ استعمال کئے جاتے تھے جس کا اثر ہیئت اجتماعی پر مترتب ہوتا تھا۔ بُرائی کا خیال بجائے خود ایک معاشری مفروضہ ہے۔

بعض افعال بُرے اس لئے خیال کئے جاتے ہیں کہ وہ ہیئت اجتماعی کے لئے مضر ہیں۔ اور خود ہیئت اجتماعی ان کی سزا دیتی ہے۔ ہمیں اس سزا کے اسباب ہیئت اجتماعی کے اس حصہ میں ملتے ہیں جو اس کی بنیادی دستور و رواج کا ایک جزو ہیں اور اس دستور و رواج کی ارتقا برسوں کی محنت و جانفشانی سے ہوئی ہے اور یہ فطرت کی اس تعلیم کا نتیجہ ہیں جو ایک زمانۂ دراز تک اوس نے بے شمار وحشی نسلوں کو دی ہے۔" یہ تعلیم ہیئت اجتماعی کی معاشری ضروریات معاشری انتخاب و امتیاز سے متعلق ہے جس کا عدم حصول یا اس کی بجا آوری سے انکار ہیئت اجتماعی کی فنا کا ضامن ہوتا ہے گویا یہ ایک نوعیت کی معاشری موت ہوتی ہے۔

جو کچھ جرایم کے متعلق کہا گیا ہے اتلاف حقوق پر بھی وہی بات عاید ہوتی ہے ایک قدیم وحشی اپنے ساتھی کے خلاف کسی جرم کا مرتکب ہوتا تو یہ خلاف ورزی ایسی تھی کہ ایک جانور نے آج ایک دوسرے جانور کو مار ڈالا۔

منافی الغیض حرکات اور انتقام کا جذبہ جس شدت کیساتھ ابتدا انسانوں میں تھا وہ آج جانوروں میں موجود ہے خواہشات نے جسمانی اقتدار و حکومت کے حصول کیلئے یہ صورت اختیار کی ہے۔ بقائے وجود کی حیوانی کش مکش پر نہ اخلاق کا اطلاق ہوسکتا ہے اور نہ بداخلاقی کا۔

جب انسان ایک دوسرے کے حقوق میں خلل انداز ہونے لگے تو ہیئت اجتماعی اس جانب متوجہ ہوئی اور جیسے ہی انتقام کے اصول معاشری رواج یا قانون سے ترتیب دئے جانے لگے۔ سزا کا انحصار معاشرہ کے اختیار و منظوری پر چھوڑ دیا گیا اور

یہ فعل قابل مواخذہ تصور ہونے لگا جب انسان نے دیکھا کہ اس کے چند افعال (جو اس کے تعمیل کے خلاف سرزد ہوتے) کی یا تو ہیئت اجتماعی نے ممانعت ہی کر دی ہے یا اوس نے افراد کو انتقام کی اجازت دے رکھی ہے تو اس کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں یہ محسوس ہونے لگا کہ اگر کسی شخص کو ہیئت اجتماعی کا رکن بنا رہنا منظور ہے تو اس کو ان افعال سے باز آنا چاہئے باہمی مقابلہ و مسابقت میں فتح کا امکان دونوں طرف ہے اس لئے کسی شخص کو اس کا یقین نہیں ہوتا کہ اس کا ایک خاص فعل رکن اثرات کا ذمہ دار ہوگا۔ مگر ہیئت اجتماعی کے خلاف واحد ہستی بے زور ہے اور سزا سے بچنے کا اس کو بہت کم موقعہ ہے۔

رفتہ رفتہ ہیئت اجتماعی کے رسم و رواج اسقدر استوار ہو گئے کہ اسکے مقررہ دستور سے خفیف سے خفیف خلاف ورزی بھی نہ صرف ایک بے موقعہ اور انوکھی حرکت معلوم ہونے لگی بلکہ یقینی ہیئت اجتماعی کے لئے مضر رساں بھی اور اس لئے یہ فعل ناقابلِ درگذر و نفرت انگیز ہو گیا۔

ہیئت اجتماعی کی ناپسندیدگی اور اس کے یہاں مقبولیت کی توقع یہ قوتیں نیکی و بدی کی ابتداء ہیں یہاں یہ امر خارج از بحث ہے کہ تاریخی نقطۂ نظر سے ایذا رسانی کا مفہوم پہلے وجود میں آیا ہے یا جرم کا۔

اکثر مورخین کا خیال ہے کہ ایذا رسانی کا مفہوم پہلے وجود میں آیا ہے۔ اور یہ بلا شبہ درست ہے کہ بہت ساری ایذا رسانیاں رفتہ رفتہ جرایم کی فہرست شامل ہو گئیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض جرایم ایذا رسانیوں سے قبل کے ہیں جیسے زنا کا فعل قبل اس کے کہ وہ ایذا رسانی تھا جرم قرار دیا گیا۔ یہ کچھ بھی ہوگا مگر اہم مسئلہ یہ ہے کہ ایذا رسانیاں اور جرم دونوں ہیئت اجتماعی کی منظوری سے خلاف ورزیاں قرار دی گئیں اور اس معاشری منظوری سے قبل گناہ یا بد اخلاقی کا اطلاق ایسے افعال پر ہوتا ہی نہ تھا

نہ صرف مفہوم اخلاق تاریخی اسباب کا نتیجہ ہے۔ بلکہ اصول اخلاق بھی تمدن اور معاشرہ کے تغیرات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ آج اگر ایک جانور دوسرے جانور کو مار ڈالے جس طرح یہہ بداخلاقی ہوسکتی ہے۔ بالکل اسی طرح کسی زمانہ میں ایک انسان کا دوسرے کو مار ڈالنا تھا۔ آج بھی میدان جنگ میں ایک انسان دوسرے کو مار ڈالے تو یہہ بداخلاقی نہیں۔ اگر وہی شخص کسی اور حیثیت سے اس فعل کا مرتکب ہو تو یہہ قتل کہلائیگا اور ایک گناہ بھی۔

بعض افعال ایسے ہیں جن کے اچھے یا برے ہونیکا نہایت مشکل سے تصفیہ کیا جا سکتا ہے مثلاً جنرل فنسٹن (General Funstone.) نے اگیونالڈو (Aguinaldo) کو نہایت دہوکے سے گرفتار کرلیا اور اوسکا یہ فعل بہت ساروں کے پاس بہت ہی برا قرار نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ فنسٹن نے ان معاشری اصول کو مدنظر رکھا جن کی پابندی دوران جنگ میں ایک "مہذب" قوم پر لازم ہے کہ ہاں یہ اور بات ہے کہ ہم مہذب اور غیر مہذب جنگ میں فرق کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔ مگر برخلاف اس کے چند اتحادیوں نے پیکن (PEGKEN) اور ٹن سن (ORTAN SEN) کے خزائنے لوٹ لئے اور اس فعل کو قریب قریب ہر ایک نے برا کہدیا اس لئے کہ مہذب اقوام کے معاشری ضمائر نے اس کو ناپسند کرتے ہوئے حال ہی میں اس کو ایک رواج بنا دیا تھا۔

تجارت میں مقابلہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا ایک عام دستور ہے جسے علم المعیشت کے ماہر نہ اخلاقی ہونے کا اطلاق کرتے ہیں نہ بداخلاقی کا مگر یہی مقابلہ اگر ہیئت اجتماعی کے چھوٹے سے حصہ میں (یعنی ایک خاندان میں) ہو تو اس کی تائید کبھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ ایک زمانہ سے ہیئت اجتماعی نے تسلیم کرلیا ہے کہ اس کی آسودہ حالی کا انحصار اور اوس کی ترقی کا مدار خاندانوں میں اتحاد و اتفاق پر ہے۔ کسی کی خانگی جائداد کو بلا معاوضہ لے لینا عموماً برا ہی سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب کسی کا گھر اس لئے اڑا دیا جائے کہ

مشتعل ہونے والی آگ فروغ ہو جائے تو یہہ فعل اخلاقاً یا قانوناً برا نہ ہوگا۔ یہہ ہئیت اجتماعی کے اصول کی غیر معمولی قوت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کسی خاص فعل پر اچھے یا بُرے کا اطلاق ہو نہیں سکتا اس لئے کہ وہی فعل خاص حالات میں ہئیت اجتماعی کی ارتقار کی منزلوں کے لحاظ سے اچھا یا بُرا دونوں ہو سکتا ہے۔ گو یا ہئیت اجتماعی کی رائے پر افراد کے افعال کا اچھے یا بُرے ہونے کا انحصار ہے۔

یہاں تک تو اُن افعال سے بحث تھی جن کا اثر فرد واحد سے گزر کر دوسروں پر ہوتا ہے۔ یہی اصول دوسری صورت میں بھی باقی رہتے ہیں یعنی اُن افعال سے جن کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اثر ایک شخص کی ذات پر ہی ختم ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک شخص ایسی چیز کا عادی ہے جس کے اثرات اسکی ذات تک ہی محدود ہیں اور جس کو عموماً ہم بُرا کہتے ہیں اور نقص یا عیب جانتے ہیں۔ یوں دیکھئے تو دراصل اس کا مقصد یہہ تھا کہ وہ فعل اس شخص کی صحت کے لئے مضر ہے۔ شراب ایک معمولی بچے کے لئے مضرت رساں ہے مگر ایک مریض کے لئے مفید۔ نیکی کے اصلی مفہوم میں اخلاق یا بداخلاقی کا کوئی شایبہ نہ تھا۔ اگر ایک جانور کسی چیز کو حلق تک بھر لے تو ہم اس فعل کو بداخلاقی سے تعبیر نہیں کرتے۔ جب پہلے پہل ایک وحشی جو ہئیت اجتماعی سے علیحدہ رہتا تھا۔ اپنا کوئی عضو قطع کر لیتا تو اس وقت نیکی یا بُرائی کا کوئی خیال پیدا نہ ہوتا تھا، خیال اس قدر تھا کہ اس کے جسمانی اور مادی نتایج کیا ہوئے" کہ ان نتایج کا کیا باعث ہوا۔ جن یا بھوت کا کام تہا۔ اعجاز تہا یا قدرتی اثرات تھے جسطرح کسی نے اپنے مادی منفاد کی وجہ ان چیزوں کو اچھا ٹھرایا اسی طرح ہئیت اجتماعی نے بھی ان چیزوں کو اچھا قرار دیا جو اسکی زندگی میں قیام تسلسل کے ذمہ دار ہوتے جب ہئیت اجتماعی کے مفاد کا خیال آجاتا ہے تو ہم اخلاقیات کے مفہوم پر پہونچتے ہیں کس فعل پر اظہار ناپسندیدگی یا خوشنودی کا معیار اب ہئیت اجتماعی کا نقصان یا مفاد ہو جاتا ہے صدیوں کے مروجہ اصول نے ایک شخص کے خیالات و افعال کو ہئیت اجتماعی کے معیار کے

ر انداز لیتے ہیں یعنی اس میں نیکی یا بدی کا احساس پیدا کر دیتے ہیں بمعاشری معیار سے جو چیز ایک شخص کے جسمانی مفاد کا باعث ہے وہ اخلاقاً بھی درست ہے ابتدا جو افعال ایک شخص کے لئے جسمانی اہمیت رکھتے تھے اس خیال سے کہ وہ چند معاشری نتائج کے ضامن ہے ایک اخلاقی اہمیت بھی اختیار کرنے لگے آج اگر ہیئت اجتماعی کا کوئی رکن اپنے حلق تک پھیر لینے کا عادی ہے تو یہ فعل اس کو اپنے ساتھیوں میں ناپسندیدہ بنا دے گا۔ یا یہ کہ وہ دوسروں کے لئے ایک بڑی مثال ہو گی۔ ہر حالت میں معاشری حالات کے مدِ نظر ایک ایسے فعل کو جو در اصل ایک ذاتی اور جسمانی فعل تھا۔ اخلاقی اہمیت مل گئی۔ یہ صرف ایسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان ہیئت اجتماعی میں رہنا سیکھ لیں اور وہ اس کا خوف کرنے لگیں کہ ان کی وہ عادت جس کا اثر ان کی ذات تک محدود معلوم ہوتا ہے دوسروں کو بھی متاثر کر دے گی اور اوس وقت ہم ان افعال کو ایک اخلاقی وصف لگا دیتے ہیں جن کے متعلق ابتدائً ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا اثر ایک شخص کی ذات تک ہی محدود رہے۔

انسان اور حیوان کے باہمی تعلقات کے متعلق بھی یہی بات درست ٹھرتی ہے کسی جانور کو مار دینا بجائے خود نہ کوئی بُرا فعل ہے اور نہ اچھا۔ مگر اس کا امکان ہے کہ جانوروں پر ظلم ایک شخص کے کیا رکٹر کو بڑی حد تک متاثر کرے ہیئت اجتماعی نے اِس فعل کو ناپسند کیا۔

پس معلوم ہوا کہ کسی شخص کے افعال خواہ ان کا اثر اس کی ذات تک محدود معلوم ہو یا اُن کا اثر دوسروں تک وسیع ہو جائے معاشری لحاظ سے اچھے یا بُرے قرار پائے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ "سارے انفرادی اخلاقیات معاشری اخلاقات کا عکس ہیں" ضمیر یعنے وہ قوت جو اچھے اور بُرے میں تمیز کرتی ہیں بجائے خود معاشری اثرات کا ایک تاریخی نتیجہ ہے سنڈرلینڈ (Sutherland) کی اِس تعریف سے ہیں

متفق ہونا پڑیگا کہ "جبلت اخلاقی" نام ہے اس غیر محسوس میلان طبیعت کا جو اُن حساسات کی تائید
میں انسانی دلوں میں پڑ رہا ہے جو سبب اجتماعی کی شادمانی کے ضامن ہیں۔ ہمیں اسکے اس خیال سے
بھی متفق ہونا پڑیگا۔ کہ:-

"کینٹ (Kant) گرین (Green) اور سجوک (Sidgwick) کے اس
نظریہ کی کوئی بنیاد نہیں کہ باطنی ادراک (ضمیر) خلقی ہے۔ عطیہ قدرت ہے۔ آسمانی ودیعت ہے
ایک عجب خیر بعید الفہم مخفی اور کبھی نہ غافل رہنے والی قوت ہے جو ہمارے چال چلن اور عادات کی
محاسب اور نگران بنی رہتی ہے۔ برخلاف اسکے ہئیت اجتماعی جس کی تعریف کرتی ہے ایک فرد بھی
اسکی تعریف کرنا سیکھ لیتا ہے اور جس شئے کی وہ تعریف کریگا اسکو خود اپنے لئے اختیار کرنے کی
کوشش کریگا۔"

وجدان یا ہدایت کا کوئی سا بھی اخلاقی نظریہ درست ہو مگر اس میں شبہہ باقی نہیں رہتا۔
کہ انسانی اخلاقیات نتیجہ ہیں ایک خاموش انکشاف کا جسمیں معاشری اثرات کو اہم دخل ہے۔

یہ اخلاقی ادراک کی ابتدا ہے جسکا وجود اور جسکے افعال انسانی زندگی کے واقعات میں
جن میں شبہہ کی کچھ بھی گنجایش نہیں۔ ایک شخص پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے چونکہ یہ صدیوں کے
معاشری اثرات کے جمود کا نتیجہ ہے۔ مگر ان کے مجموعی اثرات کی رفتار اسقدر سست رو کہ
ایک شخص ان کی اہمیت اور ابتدا سے ناواقف محض رہتا ہے۔ مانا کہ ضمیر کی ایک جداگانہ
حیثیت ہے مگر بجائے خود وہ ایک بالکل آزاد زندگی یا اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ جانوروں کی
جبلت کی طرح ہے۔ صدیوں کے تجربہ نے حیوانی عادات پر ایک پائیدار مہر لگادی ہے کہ
کوئی خاص طرز عمل عالم اضطرار میں بھی ہر دفعہ ایک ہی التزام سے اختیار کیا جانے لگا۔

یہہ کلیہ بالکل لازوال نہیں جس طرح جبلت اپنی اصلیت میں ایک تاریخی نتیجہ ہے۔
جو رفتہ رفتہ تجربات و واقعات کے مد نظر ایک خاص صورت اختیار کرلی۔ جہاں بچانے کی
اضطراری حرکت باقی ہے مگر وہ خاص طریقہ جو اضطراری طور پر اختیار کیا جاتا تھا۔ زمانہ

اور وقت کے لحاظ سے بدلتا رہا وہ حرکت تو باقی ہے مگر اس میں اصلاح اور تبدیلی ہوگئی ہے انسانوں میں اخلاقی احساس اور متمدن سوسائیٹوں میں روحانی زندگی کے وجود میں شبہ نہیں مگر اس احساس اخلاق کے اصول ان اثرات کے ساتھ ساتھ بدلتے جاتے ہی جنھوں نے پہلے پہل ان کی ابتدا کی تھی۔ اس سے انکار لغویت کے مرادف ہوگا کہ افراد کی طرح عوام بھی اخلاقی قوتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ برخلاف اسکے ساری ترقیوں کا راز غیر ممکن الحصول تصور کردہ مکمل اخلاق کے جاننے اور اسکے حصول کی کوشش میں پنہاں ہے۔ صفحات تاریخ ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں کہ جب اقوام نے افراد کی طرح نہایت بے غرضی سے اپنی اعلیٰ زندگی کی فیاض تحریکوں سے کام لیا ہے اخلاقی اور مذہبی مصلحوں نے کوئی بے سود کام نہیں کیا ہئیت اجتماعی اور افراد پر روحانی زندگی کے اثرات کی ایک غیر ضروری بحث ہے۔ وہ بات جو اکثر فراموش کردی جاتی ہے اور جس پر بار بار زور دینے کی ضرورت پڑتی ہے یہہ ہے کہ اخلاق کے اصل اصول معاشری قوتوں کا نتیجہ ہیں اور ان ان گنت پیچیدہ معاشری اثرات میں جو اسکی ابتدا کے ضامن ہوتے ہی معاشی قوتیں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مادہ ہمیشہ اخلاق سے پہلے وجود میں آیا ہے اور انفرادی افعال نے معاشری افعال کی طرح اخلاقی مفہوم سے پہلے ایک مادی اہمیت اختیار کرلی تھی۔ جب یہہ معلوم ہوا کہ مادہ اخلاق سے پہلے وجود میں آیا ہے تو کچھہ بھی تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ ہئیت اجتماعی کے مادی حالات جو وسیع ترین معنوں میں معاشی حالات ہیں۔ برابر اخلاقی مفہوم کے اصول کو بدلتے رہتے ہیں یونہی اٹکل سے چند مثالیں لیجئے۔ یونان قدیم کے علمار اخلاق نے (جن کے اکثر نظریہ بہت سارے امور میں زمانہ حال کے نظریوں سے کم از کم ضرور مطابق ہیں) غلامی کو برا قرار نہ دیا تھا اسی طرح چند انگریز نوآبادیاں بسانے والے جو اپنے وطن میں غلامی کے خیال کو نفرت کی نگاہ سے ہی دیکھتے تھے جنوبی امریکہ ریاستوں میں آکر غلامی کے نہایت گرم جوش اور سچے حامی بن گئے۔ جنوب کے عیسائی پادریوں نے تک نہایت صداقت کے ساتھ غلامی کو گناہ قرار دینے سے

انکار کر دیا۔ اگر شمالی اور مغربی ریاستوں کے لوگوں کو بھی اُنہی موسمی اور معاشی حالات کا مقابلہ کرنا ہوتا تو بہت کم شبہ رہجاتا ہے کہ جب تک وہ یورپ کی ترقی یافتہ صنعتی تہذیب سے دوچار نہ ہوتے اُن کا اخلاقی نظریہ بالکل اپنے جنوبی بھائیوں کیطرح ہوتا۔ انسان واقعات و حالات کا پتلا ہے اور اعلیٰ اخلاقی عقائد ماحول کے کڑے اور سخت قوانین سے مستثنےٰ نہیں۔ ازمنہ متوسطیٰ کے علمار اخلاق کو حقوق جاگیرداری بڑے نہ معلوم ہوئے نیو انگلنڈ (New England) کے محنتی جفاکش بانیوں کو ان محاسن سے جدا محاسن کی ضرورت تھی جو ادن کے پاکیزہ خیال جانشینوں کو اختیار کرنے پڑے۔ امریکن انڈین کو محبت۔ ایثار اور بغیر مزاحمت کے فتح کرنے کے معنی اگر برائی کا عدم وجود نہ تھا تو نوآبادیان بسانے والوں کا غائب ہو جانا ضرور تھا۔ ایک سرحدی سوسایٹی کے اخلاقی نصب العین اسکی ضروریات کے مدنظر ایسے ہی جایز ہیں جیسے بالکل مختلف عقائد ہیت اجتماعی کی دوسری منزلوں میں اُن کے جانشینوں کے جایز تھے۔ جہاں نواری کا وصف بہ نسبت صنعتی حالات کے ملک کی زرعی حالات میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ استاد و شاگرد کے باہمی اخلاقی تعلقات دور سے کارخانجات میں وہ نہ رہے جو گلڈ کی اخوت میں تھے جو درائی اور عزت کا خیال اور انتقام کا جذبہ طبقہ شرفا اور فوجی جماعت کا طرہ امتیازی ہے معاشی حالات کی تبدیلی کے ساتھ۔ جو دستوریت اور صنعتی کاروبار کی ترقی کی جانب مایل ہوتے ہیں اصول کا مفہوم بھی بدلتا جاتا ہے۔

آج ہم قوانین بین الاقوامی اور بین الاقوامی تعلقات میں اصول اخلاق کی پابندی کے متعلق بہت کچھہ سنتے ہیں۔ ہم یہہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک ملک اس قدر طاقتور ہو جائے کہ وہ دوسروں کو اپنے قابو میں رکھہ سکے (جیسا کہ شہنشاہی روم نے کیا تھا) یا جب دنیا کی بڑی بڑی قومیں ایسے مساوی آجائیں کہ ایک قوم اپنے ہمسایہ قوم کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرے اور چھوٹے ممالک بڑی قوتوں کے باہمی حسد وجلاپے کی وجہہ محفوظ رہیں۔ یہاں سیاسی اختلاف کی حالت بھی انفرادی اخلاق کی ہے انفرادی انتقام اسوقت تک

فنا نہیں ہوتا جب لوگ ایک مطلق العنان زبردست شخص کے زیر حکومت نہ ہوں یا جب تک وہ اس امر کو مانتے ہوئے کہ قانون کی نظروں میں سب برابر ہیں وہ عدالتوں کے فیصلوں کو ماننے کیلئے تیار نہ ہوجائیں بین الاقوامی قوانین اس وقت وجود میں آئے جب سولہویں اور سترہویں صدی میں معاشی اثرات چھوٹی چھوٹی مختلف ریاستوں کو ملا کر چند بڑی قومیں بناتے ہوئے مساوات کی جانب گام زنی شروع کی ہیں۔

بین الاقوامی انصاف اور عالمگیر امن اس وقت وجود میں آئیگا جب معاشی قوتیں جو ایک ساتھ چل رہی ہیں آج کل کی معرکہ آرا اقوام کو۔ بیرونی نوآبادیات کو رفتہ رفتہ متمدن اور مہذب بناتے ہوئے (گویا مقابلتہً معاشی حالات کو مساوی بناتے ہوئے) چند بڑی شہنشاہیوں میں تقسیم نہ کردیں۔

افراد میں معاشی مساوات دستوری محاسن کی تخلیق کے ضامن ہوتے ہیں اور اقوام میں صرف معاشی مساوات ہی بین الاقوامی امن وانصاف کا راستہ بنا سکتے ہیں پس تاریخ کی معاشی توضیح اگر صحیح طور سے سمجھی جائے تو اخلاقی اور روحانی قوتوں کی اہمیت سے انکار یا اس میں کمی نہیں کرتی۔ یہہ صرف یہہ بتاتی ہے کہ اخلاقی قوتیں کسی خاص زمانہ یا وقت میں کسی دائرہ میں کامیابی کے ساتھہ موثر ہوتی ہیں۔ رحم ومحبت کے محاسن ایک غارتگر وحشیوں کے گروہ کو سنائے جائیں تو بے سود ہیں مگر جب شخصی بچاؤ کیلئے جنگ وجدل کے قدیم طریقے بے کار ثابت ہوگئے ہیں ایک معلم اخلاق ہیئت اجتماعی کی حقیقی ضرورتوں کے مدنظر زیادہ مہذب طریقوں کو رواج دیکر بہت بڑا کام کرسکتا ہے۔ قدیم معاشری ضروریات سے جدید معاشری سہولتوں کے درمیانی زمانہ میں ایک مصلح اخلاق اپنی قوت واثر کو محسوس کرواتا ہے لیکن انسانی حالات کی تبدیلیوں میں ایک قسم کی حد ہمیشہ رہی ہے اور اس لحاظ سے ایک معلم اخلاق کی ضرورت بھی جو انسانوں کو ایک نصب العین بخشے اور شاہراہ ترقی پر گرم رفتار کردے۔ جب تک معاشی حالات تبدیل کیلئے تیار نہ ہوجائیں ایک مصلح اخلاق کی خواہش لایعنی و بے سود ہے۔

اگر حالات تیار ہوں تو اصلاح بھی کارگر و مفید ہوسکتی ہے۔ اس طرح اعلیٰ اخلاقی نصب العین ترقی کی جد و جہد میں ہمیشہ صف اول میں رہے ہیں۔

معلم اخلاق معاشرہ کا مقدمۃ الجیش ہے اسکی پیروی اس وقت تک ہوگی جب تک عوام کو اس پر کامل بھروسہ ہو اصلی معرکہ ہیت اجتماعی کی ساری بڑی قوتیں لڑیں گی جن میں معاشی حالات فیصلہ کن ہوں گے۔

انسانوں میں انفرادی ارتقار اخلاق ہوتی ہے اور اجتماعی بھی ہیت اجتماعی جسقدر مہذب و متمدن ہوگی اس کا طرز زندگی بھی اسی قدر اچھے اخلاق کا نمونہ ہوگا۔ زیادہ متمدن اور زیادہ مہذب ہونیکے لئے نیچ طبقوں میں اصول اخلاق کی اشاعت لازمی ہے اگر اسکے لئے بہیں ایک معاشی بنیاد کی ضرورت ہے۔ عوام کی بہ مادی ترقی پر ہمیں ان پر ایک اعلیٰ اخلاقی زندگی کے انکشاف کا موقعہ حاصل ہوجاتا ہے مگر جب تک ہیت اجتماعی کی اقتصادی حالت ارتقا و فضل نہ ہوجائے اخلاقی کی لا متناہی ترقی کیلیے نہ آزادی ہے اور نہ ایک کشادہ میدان۔ صرف اسی وقت یہ ممکن ہوگا کہ معاشی پہلو نظر انداز کردیا جائے جو اس وقت مستقیم و مستقل سمجھا جائیگا اور صرف اس وقت تاریخ کی معاشی توضیح مورخوں کے بجائے ماہرین آثار قدیمہ کے ذمہ ہوجائیگی اور یہ اک مہمل سی بات ہے۔

ہئیت اجتماعی میں اخلاقی قوتیں قانونی اور سیاسی قوتوں سے کم موثر نہیں مگر جس طرح کسی خاص زمانہ میں قانون اخلاقیات بڑی حد تک اقتصادی اور معاشری زندگی کا نتیجہ رہا ہے اگر مادہ پرستی روحانی قوتوں کے فقدان کے مماثل ہو تو تاریخ کی معاشی توضیح ہرگز مادہ پرستی پر مبنی ہیں۔ اگر ہمارا مقصد معاشی توضیح سے یہ ہے کہ اخلاقی قوتیں بجائے خود اپنی اصلیت میں معاشری ہیں اور بڑی حد تک اپنے دائرہ عمل میں ہیت اجتماعی کے معاشی تعلقات کے زیر اثر ایک خاص صورت اختیار کرلی ہے تو معاشی اور اخلاقی زندگی میں زیادہ فرق نہیں رہجاتا۔

تاریخ کی معاشی توضیح ایک معقول و سنجیدہ مفہوم میں ایک لمحہ کیلئے بھی زندگی کے اخلاقی پہلو کو معاشی پہلو کے تابع نہیں کرتی اور یہ نہ اسکا دعویٰ کرتی ہے کہ ایک انسان میں اسکے اخلاقی ادراک

اور معاشی سربزی میں کوئی لازمی تعلق ہے اور نہ اوسکو تاریخ کی مذہبی توضیح سے انکار ہے۔

یہاں صرف اس امر کو بلحاظ تاریخ بتانیکی کوشش کیگئی ہے کہ انسان کا اخلاق اوج انکی معاشری و اقتصادی ترقی کا وابستہ داماں رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کسی طبقہ کے اعلیٰ اخلاقی عقاید کی عمارت مادی ترقی کی مضبوط بنیادوں پر مبنی ہے اور یہی عقاید ہیں جو ایک پایدار تہذیب کے واحد ذمہ دار ہو سکتے ہیں پس تاریخ کی معاشی توضیح کا مفہوم اگر صحیح طور سے سمجھا جائے تو روحانی اور اخلاقی قوتوں کو نظرانداز نہیں کرتا وہ صرف اُن حالات کے بتانیکی کوشش کرتا ہے جہاں روحانی اور اخلاقی قوتیں بجا طور پر موثر ہوتی ہے۔

ایڈیٹر

درس عمل

درخشاں کوکب امید ہوتا ہے شب غم میں
دل پُر درد چشم پُرنم و یہ آبلہ پائی
بہ سمت منزل مقصد ہیں محو جادہ پیمائی
جہاں سعی و مشقت کا صلہ ہے امن پیہم میں
سیاہی رکھتی ہے گو لیلیٰ شب زلف پرخم میں
اجالا طالع امید کا ہے تخت اعظم میں
نمایاں جس کی ضو سے سرحد پستی و بالائی
نہ مڑکر دیکھ پیچھے جا چکا ہے وقت پسپائی
نہیں ہے شکوہ غم عشق کے آئین محکم میں
طلب اور جستجو میں ہمرہ باد بہاری ہو
تعاقب میں تو مرغ مدعا کے رہ سپاری ہو
کہ جسکے بال و پر مثل خضر ہوں رہبر کامل
وہاں تک منزل مقصود ہے جو تیری ہستی کی

نہ خائف ہو۔ جو گردوں سے گریزاں ہو مہ کامل
وہ ساعت ہے کہ شرق میں شفق کی لالہ کاری ہو۔
تعجب کیا جو تجھ پر رحمت خلاق باری ہو
جو ضامن ہے تری ناقابل پامال ہستی کی

ترجمہ از صاحبزادہ خواجہ میر طاہر علی خاں سلمہ۔

کشکول

ولی

ولی اُس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جوں سینے میں راز آئے

اے زباں کر مدد تو آج کہ یار
منتظر ہے بیان روشن کا

ہوں گرچہ خاکسار و لے از رہ ادب
دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز

آزاد

آئیں جہاں کی ساری آزاد صنعتیں پر
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

عاجز

جب سے اے رنگیں ادا تیرا ہے رنگ گل میں نقش
تب سے میری آہ کا ہے سینۂ بلبل میں نقش

مضمون

نہیں ہیں ہونٹ تیرے پان سے سرخ
ہوا ہے خون میرا آکے لب ریز

ناجی

مجھکو باتوں میں لگا کیا جانئے کیا کہہ گیا
لے چلا جب دل کے تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا

دیکھہ ہم صحبت کی دولت ہے نہ رکھہ چشم کرم　　لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب

مظہر

ہم گرفتار و نکواب کیا کام ہے گلشن میں لیک　　جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار
آتش کہو شرارہ کہو کو بلا کہو　　مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

کلیم

درازئ شب ہجراں زلف یار کلیم　　مجھہ سے پوچھ کہ کاٹی ہے رات آنکھوں میں

قدرت

سینہ اُسکا ہے دل اُسکا ہے جگر اوسکا ہے　　تیر ابیدا دجدھر رخ کرے گھر اوسکا ہے

ضیا

آہستہ پائوں رکھیو اسے بوئے گل زمیں پر　　سوتے ہیں اس زمیں میں نازک مزاج کتنے

حسرت

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا　　تڑپنے سے مرے دل کو ابھی آرام آیا تھا
بہاریں ہمکو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں　　گریباں چاک کرنیکا بھی اک ہنگام آیا تھا
نہیں معلوم کیا تہا جو سحر تک شمع رویا کی　　کچھہ اپنا حال پروانہ سنانے شام آیا تھا

ایضاً

ہمتیں غیروں سے کب فرصت کب اپنے غم سے ہم خالی　　چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی۔

قایم

وضع دوراں گو خوشامد دوست ہو قایم تو ہو　　ہر کس و ناکس سے دب چلنا یہہ اپنی خو نہیں

ایضاً

دل ڈہونڈہنا سینے میں مرے بوالعجبی ہے　　اک ڈھیریاں راکھہ کی اور آگ دبی ہے

بیان

ہم سرگزشت کیا کہیں اپنی کہ مثل خار　　پامال ہوگئے ترے دامن سے چھوٹ کر

بیان

ہزاروں قصر جنت کے برابر میں سمجھتا ہوں
اگر گردوں دوں آسودہ زیر خاک رہنے دے
فرشتوں کی عبادت کا مصلی ہے مرا دامن
اگر آلودگی دنیا کی اس کو پاک رہنے دو

ایضًا

پاس ناموس عشق ہے ورنہ
کتنے آنسو سے پلک تک آکے تھمے

ایضًا

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے
اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

مصحفی

آہ دل سے تو نکلی ہے لیکن
آہ کیا دل جلا کے نکلی ہے

ایضًا

فلک گر ہنستا ہے مجھ پر کسی کو
میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں

آتش

عجب کیا ہے اگر پروانے بے شمع
جلیں آتش کے مدفن پر ہزاروں

ایضًا

کون کہتا ہے بسر ہو گئے ایام جنوں
اک گریباں نظر آتا نہیں بے چاک ہنوز

ایضًا

سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے
زمیں سے دب گئے دبتے جو آسماں سے نہ تھے

مجروح

لا کھ گو جمع ہیں سامانِ طرب انگیزی
کنج غم بھی تو نہیں چھوڑ کے جایا جاتا

جلال

عشق کے کھوئے مزے درد جگر نے اٹھ کر
چپ کے بیٹھے ہیں اک لطف اٹھانے نہ دیا

عزیز

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا۔

نظم

فضائے دہر میں ہم مثل برق آ کے چلے
تڑپ کے کاٹ دیا وقت مسکرا کے چلے

ایضاً

پلٹ جاتے ہیں کیسا بات کر کے
امیروں نے یہ سیکھا ہے نگیں سے

اقبال

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔

انتخاب از اڈیٹر

Heredity
I am the family face
Flesh perishes but I live on
Projecting trait and trace
From time to time and on
I leap from space to space
Over oblivion
Thomas Hardy

میں ہوں گھرانے کا چہرا
گوشت مٹے پر میں نہیں مٹتا
کرنیں شباہت کی نہ ڈھونڈتے کی
پھیلاتا ہوں پیڑی پیڑی
میں جاتا ہوں تھان تھان
بھول کے کھنڈر سے جھراتا

ترجمہ از عظمت اللہ خان

رومانِ کائنات

ایک کا ورق

(۱)۔ علمائے ہیئت اپنے تجربات کی بنا پر کہتے ہیں کہ اس مادہ کی حالت جس سے ابتدائے
آفرینش میں چاند زمین سورج اور دیگر اجرام فلکی بنائے گئے ہیں بالکل مختلف تھی اسکی مختلف شکلیں جو آجکل ان اجرام
فلکی میں پائی جاتی ہیں موجود نہ تھیں وہ بالکل غیر مرکب تھا اور ہر جگہ اسکی ایک ہی شکل پائی جاتی تھی وہ مختلف اجرام کی
صورتوں میں علیحدہ علیحدہ نہیں پایا جاتا تھا بلکہ تمام وسعت مکان اس سے معمور تھی کروکس نے اس مادہ کا نام عنصر اولیں رکھا ہے۔
رفتہ رفتہ اس عظیم تودہ میں کچھ مرکز بنتے گئے اور ان مرکزوں کے گرد مادہ جمع ہوتا گیا اور اسطرح اسکے مختلف ٹکڑوں
میں بھی ہونا شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے شاید کئی بار ہوا یہانتک کہ کئی سورج اور انکے ساتھ انکے فلکی نظام پیدا ہو گئے۔
مادہ کی مختلف شکلیں | یہی حصول عمل جو مادہ کو مخصوص مرکزوں کے گرد جمع کر رہا تھا ان اجرام کی داخلی حالت پر بھی
اثر کرنے لگا۔ شاید حرارت اور دباؤ کی وجہ سے ان اجرام میں مادہ کی ایک نئی شکل پیدا ہوئی اور یہ شاید
ہیڈروجن تھی فعل متعدد بار ان نئی شکلوں میں ہوتا رہا یہانتک کہ مادہ کی قریب قریب وہ تمام مختلف
صورتیں پیدا ہو گئیں جو آجکل پائی جاتی ہیں۔

اجتماع اور تفریق کا یہ عمل بعض حصوں میں پہلے شروع ہوا اور بعض میں بعد از۔ یہ سمجھنے کیلئے کوئی
سبب موجود نہیں ہے کہ وہ اب موقوف ہو گیا ہے تکوین اجرام کا نظریہ کانٹ لاپلیس اور ہرشل کا قائم کیا ہوا ہے۔
اس عنصر اولیں کی ہستی کا ثبوت کیا ہے؟ کیا پہلے مادہ یقیناً مفرد تھا؟ یہ ہیں وہ سوال جو اس نظریہ کے
پڑھنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اگر سائنس انکا جواب قطعی طور پر نہیں دیسکا تو کم ازکم بعض تجربات و
نتائج نے اس نظریہ کو بہت مستحکم کر دیا ہے۔

(۱) علم کیمیا کی تاریخ کا مطالعہ کیجیئے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ کچھہ نہیں ہے۔ بگر

* ڈریپر۔ تاریخ ہیئت یلہ Protyle

اک مسلسل داستان تشریح اشیا کی۔ پانی۔ مٹی۔ اور ہوا۔ ایک مدت تک عناصر سمجھے جاتے تھے۔ لیکن آج اک بچہ جانتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دو یا دو سے زیادہ عناصر سے مرکب ہے اور اشیا کے مرکب ہونے کے یہ انکشافات اس قدر غیر متوقع اور تعجب خیز ہیں کہ علمائے کیمیا کو اس بات کا ہرگز یقین نہیں ہے کہ آج کے عناصر کل بھی غیر مرکب تسلیم کئے جائیں گے۔ پانی کے دو اجزا ہیں۔ آکسیجن اور ہیڈروجن لیکن کئی مستند علما یقین کرتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس تخریق کے لئے کوئی زیادہ قوی طریقہ موجود ہوتا تو آکسیجن اور شاید ہیڈروجن بھی مرکب بتایا جاسکتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ آجکل جو عناصر مانے جاتے ہیں وہ صرف چند اجزا کے مرکبات ہیں یا کسی واحد مادہ کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۲) اس سے زیادہ قوی ثبوت ان فلکی مادوں کا مطالعہ ہے جنہیں ہم سحابیہ روشن[۱] کہہ سکتے ہیں۔ یہ نظام شمسی سے دور چمکدار گیس کے مادے ہیں اور ایک معمولی دوربین سے صرف چمکتے ہوئے ابر کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں۔ قوی دوربینوں سے دیکھنے کے بعد ان میں سے بعض صرف ستاروں کے مجتمع گروہ پائے گئے۔ لیکن "الوان نما"[۲] کی ایجاد نے ان کی ہستی کا راز افشا کر دیا اور معلوم ہوا کہ ان میں سے اکثر ایک گیس کے تودے ہیں اور بعض میں گیس اور ستارے متحد ہیں۔ ابتدا میں ان کی اک نامرتب شکل تھی لیکن بعد کو وہ لمبے لمبے اجرام پیچاں[۳] بن گئے۔ ان میں حرارت بھی بہت پائی جاتی ہے۔ ان کے الوان ترکیبی سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں صرف دو تین ہی نہایت سادہ کیمیائی عنصر پائے جاتے ہیں اور اندازہ کیا گیا ہے کہ ان میں شاید وہ عنصر اولین پایا جاتا ہے کیونکہ ان میں مادہ کی شکلوں کے اختلاف و اجتماع کا عمل صرف ایک ابتدائی حد تک ہوا ہے۔

اجرام فلکی کی پیدائش کے متعلق قیاس۔	کیا کوئی ایسا طریقہ فرض کیا جاسکتا ہے جس سے اس عنصر اولین کے ایک ٹکڑے نے موجودہ اجرام فلکی کی شکل اختیار کر لی ہوگی؟

۱۔ Nebulae ۲۔ Spectroscope ۳۔ Spirals

بعض علمائے ہیئت نے مندرجہ ذیل مفروضہ پیش کیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق پہلے اس عظیم تودہ میں محوری حرکت شروع ہوئی لیکن اس حرکت کا سبب بتانے کے لئے جو مفروضات موجود ہیں وہ نہایت کم زور ہیں جب اس سحاب روشن کی حرارت کم ہوئی تو وہ جسامت میں بھی کم ہو گیا اور اس لئے نہایت تیزی سے گردش کرنے لگا۔ یہانتک کہ اس تودہ عظیم کا یکجا رہنا مشکل ہو گیا اور ایک سیال مادہ کا حلقہ اسکے خط استوا پر جمع ہونے لگا اور رفتہ رفتہ یہ حلقہ اس سے علیحدہ ہو گیا۔

لیکن یہ حلقہ اس کرہ کے گرد اور اسکے محیط کے متوازی حرکت کرنے لگا اور اسکی وجہ کشش ثقل تھی جو ہر مادی شئے میں پائی جاتی ہے۔ اسکے علاوہ اس حلقہ میں جو اب مجتمع ہو کر خود ایک کرہ بنگیا تھا وہ گردش محوری بھی موجود تھی جو اوس میں بڑے کرہ سے علیحدہ ہوتے وقت پائی جاتی تھی۔ غرض اس طرح یہ چھوٹا سیارہ حرکت محوری میں بھی مشغول تھا اور اس بڑے کرہ کے طواف میں بھی۔

اس عمل کی تکرار سے کئی سیارے پیدا ہو گئے جو اک مشترک مرکز کے طواف میں اور خود اپنے محوروں پر گردش میں مشغول تھے اور ان سب کے مرکزی مقام پر گیس کا ایک عظیم الشان ملتہب کرہ موجود تھا۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوا کہ ان سیاروں سے بھی کوئی حلقہ علیحدہ ہو کر ان کے گرد پھرنے لگا اور اس طرح بعض سیاروں کے ایک اور بعض کیلئے ایک سے زیادہ چاند پیدا ہو گئے؟

ہمارے نظام شمسی کی قریب قریب تمام حرکتیں اس نظریہ کے مطابق ہیں یہی عمل شاید اس عنصر اولین کے ہر علیحدہ شدہ تودہ میں ہوا اور اس طرح اک غیر متناہی تعداد ان شمسی نظاموں کی پیدا ہو گئی۔

آثار حیات کہاں سے پیدا ہوئے۔ ہزاروں سال کی مدت کے بعد پہلے ان کروں کی سطح سرد ہونے لگی اور جمکر سخت ہو گئی اور اس طرح اک زمانہ دراز کے بعد ان کی سطح آبادی کے قابل تھی۔ لیکن آجکل کے نہایت محنت سے کئے ہوئے تجربات بھی یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ زمیں پر پہلا اثر حیات صرف

زمینی مادہ کے ارتقا سے پیدا ہوا۔ نہایت احتیاط سے مرکب کی ہوئی اشیا جو حد درجہ مدحیات ہیں پہلے گرم کیجاتی ہیں تاکہ اس میں رہنے والے جراثیم مرجائیں اور بعد کو یہ مرکبات ایک مدت دراز تک ایسے حالات کے زیر اثر رکھے جاتے ہیں جو زندگی کیلئے نہایت موزوں ہیں۔ لیکن اسمیں ایک چھوٹے سے چھوٹا کیڑا ابھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

"عنصر اولین" کیونکر پیدا ہوا؟ اس میں گردش کہاں سے آگئی؟ یہ اور اس قسم کے متعدد سوالات ایسے ہیں جن کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ علم ہیئت ان مقامات پر پہونچکر عاجز ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ تجربات و معلومات خود اس قدر کمزور توجہات پر مبنی ہیں کہ مبدء فیاض کی ہستی کا اعتراف ہیت دانوں کو کرنا پڑتا ہے۔

(۲) اجرام فلکی خواہ کسی بھی طریقہ سے پیدا ہو گئے ہوں کرۂ ارض کی تکوین خواہ کسی طرح سے بھی ہوئی ہو۔ لیکن اس پر انسان کہاں سے آگیا اور اس نے تاریخی زمانے سے قبل اپنی زندگی کس طرح بسر کی؟ یہ بھی ایک اہم سوال ہے جسکا جواب قطعی طور پر نہیں دیا جا سکتا زمانۂ تاریخی سے پہلے کے کوئی ایسے آثار ہمارے پاس موجود نہیں ہیں جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ مختلف اقوام انسانی ایک ہی اصل سے پیدا ہوئی ہیں لیکن یہ نظریہ علم حیوانات۔ اور علم وظائف الاعضا سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ تاہم ماہرین آثار قدیمہ و طبقات الارض یہ یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتے کہ انسان نے سب سے پہلے کس قطعۂ ارض پر اور کس زمانے میں قدم رکھا۔

الفاظ اور متخیلہ | انسان کی اک نمایاں خصوصیت جسمانی یہ ہے کہ وہ سیدھا چلتا پھرتا ہے اور اپنے سر کو بہت گھما سکتا ہے جسکی وجہ سے اسکی وسعت منظر زیادہ ہے۔ زمانہ قدیم مین اس فراخ نظری نے انسان کے متخیلہ کو اکثر مشغول رکھا اور ترقی دی۔ اسکا سینہ وزن شکم اور خمیدگی کے نہونے کی وجہ سے بہ آسانی بڑھتا گیا۔ ور اس میں اعضائے تکلم کو ترقی ہوئی۔ الفاظ اور زبان کی وجہ سے اسکے تخیل مین اک نمایاں اضافہ ہوا کیونکہ پیچیدہ اور اعلیٰ خیالات صرف

الفاظ ہی کی امداد سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ایک گھوڑا بغیر الفاظ کے سوچ سکتا ہے یعنی وہ اپنے راتب کے وقت کو پہچانتا ہے یا کوڑے کو دیکھ کر اپنی شرارت سے باز آجاتا ہے لیکن دماغ کی یہ بالکل ادنیٰ اور ابتدائی وضع کی مصروفیت ہے۔ جب آپ کسی گروہ کے خواص کی تشریح کرنے لگتے ہیں تو افراد کا مقابلہ کرنے کے بعد آپ ایک خاصہ مشترک معلوم کر لیتے ہیں لیکن اس سے قبل کہ آپ اس تشریح کو جاری کریں آپ کو یہ ضرورت ہوتی ہے کہ اس خاصہ کیلئے کوئی نام کوئی لفظ مقرر کر کے یاد کر لیں تاکہ تشریح کے آئندہ مدارج میں آپ اسے بھول نہ جائیں۔ غرض اعلیٰ اور مرکب خیالات صرف الفاظ ہی کی مدد سے جاری رکھے جا سکتے ہیں اور الفاظ اور زبان کے ظہور کی وجہ سے انسان کے متخیلہ کو ترقی ہوئی۔

<u>ابتدائے تمدن</u> متخیلہ کی اس مصروفیت کے نتائج نہ صرف پیدائشی طور پر اولاد میں منتقل ہوئے بلکہ ان کی اشاعت معاملت اور میل جول کی وجہ سے بھی ہوئی۔ جب اک زمانہ دراز کے بعد انسان مختلف ملکوں میں منتشر ہو گیا تو جغرافیائی حالات کے زیر اثر ہر ملک کے باشندوں میں جسمانی اور دماغی اختلاف اور تنوع پیدا ہونے لگا۔ موجودہ ملتوں کی بالکل ابتدائی شکل اس وقت کے ہر جداگانہ خاندان میں پائی جاتی تھی اور جنگ وغیرہ میں افراد و قبائل کے کارناموں کی وجہ سے آبادی کی اک نہایت سادہ تقسیم بادشاہ امراء اور عوام کی صورت میں پیدا ہوئی۔

ایسے مقامات کی آبادی میں جہاں کی میدانی آب و ہوا معتدل تھی سب سے پہلے آثار تمدن پیدا ہوئے اور وہ لوگ بہت جلد تہذیب کے اک وقیع درجہ تک پہونچ گئے چنانچہ مصر عراق عرب چین اور جزائر شرقی الہند زمانہ قدیم میں سب سے پہلے متمدن ہو گئے تھے۔

<u>خصوصیات</u> انسان قدیم کی خصوصیات دریافت کرنے میں ہمیں علم النفس آثار قدیمہ اور موجودہ نیم متمدن اقوام کے حالات سے مدد ملتی ہے۔ سب سے پہلے خصوصیت زبان کی ہے جو انسان کے ساتھ ہمیشہ سے وابستہ ہے۔ الالس یا غیر متکلم انسان کی ہستی صرف نظریہ ارتقا تک ہی محدود رہے اور اسکے وجود کی شہادت کسی ذریعہ سے نہیں دی جا سکتی۔ دیگر حیوانات کی زبان صرف

محسوسات کا نتیجہ ہے اور اوسکے برعکس انسان کی زبان اسکے تخیل کے نتائج کا اظہار ہے۔

انسان کی ابتدائی زبان کیا تھی؟ یہ اک ایسا سوال ہے جسکا قطعی جواب ناممکن ہے۔ کیونکہ قدیم متمدن ممالک مثلاً چین "مصر" عراق عرب وغیرہ کی زبانیں اسقدر مختلف ہیں کہ یہہ نہیں خیال کیا جا سکتا کہ انسان کی ابتدائی زبان ان زبانوں سے ملتی جلتی ایک زبان تھی۔ جس کی یہہ مختلف شاخیں ہیں چینی زبان آواز کے چھوٹے چھوٹے مفردات کی زبان ہے۔ مصر و بابل کے زبان میں مقررہ اوزان و مشتقات ہوتے ہیں اور جزائر شرقی الہند کی زبان اسقدر عجیب ہے کہ وہ اک طویل اور مرکب خیال کا اظہار صرف ایک لفظ سے کر سکتی ہے۔

البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی پہلی زبان بہت سادہ تھی غیر متمدن اقوام کی زبانیں ابتک اک کثیر تعداد کا شمار نہیں کر سکتیں اور ان میں تعمیمی الفاظ مثلاً "درخت" "جانور" وغیرہ نہیں ہوتے حالانکہ ہر درخت اور ہر جانور کے لئے الفاظ موجود ہیں۔ درحقیقت زبان اور خیال کا اثر باہمی ہوتا جسطرح زبان کی وجہ سے الفاظ پیدا ہوتے ہیں اسی طرح خیال کے ارتقاء کے ساتھ زبان بھی ترقی کرتی ہے۔

زبان کے علاوہ انسان کی ایک اور خصوصیت مذہب ہے۔ انسان میں توجیہ و تاویل کرنیکی خصوصیت فطرۃً ہوتی ہے اور سب سے پہلے انسان کا مذہب ہمارے خیال میں اللہ کی توحید تھا جسکی تنہا قدرت کا ظہور اسے ہر نا قابل فہم (واقعہ فطرت میں نظر آتا تھا) لیکن خارجی اسباب اور افراط تخیل کی وجہ سے قانون قدرت کے ہر شعبہ اور ہر ظہور کے لئے ایک دیوتا بنا لیا گیا اور اسکی مختلف انواع سے پرستش ہونے لگی۔

انسان میں ہمیشہ سے جمعیت کی خواہش اور آثار نظر آتے ہیں اور خاندان اسکی اولین شکل تھی حفاظت ملکیت اور خواہش تمدن کی وجہ سے اجتماع شروع ہوا۔ افراد و قبائل کے جنگی اور دیگر کارناموں کی وجہ سے امتیاز طبقات بھی پیدا ہو گیا جسکی وجہ سے تقسیم عمل کا ظہور ہوا جو ہیئت اجتماعی قائم کرنے کے لئے اک نہایت مضبوط رابطہ ہے اسکے علاوہ نسل مذہب

زبان ملک اور اغراض کے اتحاد نے ملتیں قایم کرنے اور علایق کو مضبوط کرنے میں بہت مدد دی۔
انسان کے قدیم مشاغل میں سب سے پہلے شکار اور اسکے بعد مفید جانوروں کا پالنا اور زراعت ہیں۔ زراعت میں پہلے انسان صرف وہی غذا حاصل کرنے پر اکتفا کرتا تھا جو قدرتاً میدان یا جنگل میں اُگ جاتی تھی اسکے بعد رفتہ رفتہ وہ اک مخصوص انتظام کے ساتھ زمیں سے غذا کے خزائن حاصل کرنے لگا۔ اسکے اوزار جو ابتدا میں اعضا جسمانی مثلاً ہاتھ ناخون اور دانتوں کی تقلید میں بنائے گئے تھے۔ اسقدر سادہ تھے کہ آج ہم بمشکل یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ اُن سے کیا کام لیا جاتا تھا۔ زراعت کے کام میں عورتیں بہت حصہ لیتی تھیں۔
انسان اس زمانے میں آگ سے بھی بخوبی واقف تھا۔ جو حقیقتہً ابتدائی تمدن کے اک کثیر حصہ کی وجہ اور سبب ہے۔ آگ اجتماعی کی پرورش کرتی ہے۔ اسی کے گرد گھر اور خاندان کی لذتیں محسوس ہوتی ہیں۔ یہہ کھانا پکاتی ہے یا جنگلوں کو صاف کرتی ہے۔ مکان کے لئے نوکدار لکڑیاں تیار کرتی کشتی کے لئے درخت کا تنا کھوکھلا کرتی ہے اور سخت دہاتوں پر غالب آتی ہے۔
انسان کے پہلے مکان خطرات سے حفاظت کیلئے بنائے گئے تھے اور یہہ درختوں کے حلقوں اور قدرتی غاروں کی نقل تھے جسمیں وہ جنگلی جانوروں کے حملے اور دیگر خطرات سے پناہ لیتا تھا۔ یہہ مکان ایسے مقامات پر بنائے جاتے تھے جہاں پانی اور ضروریات غذا جلد میسر ہوسکیں۔
یہ کسقدر تعجب کی بات ہے کہ لباس کا استعمال انسان نے زیادہ تر حفاظت کے لئے نہیں بلکہ اس خواہش کی تسکین کیلئے کیا جو اسے ہر مناسب و خوبصورت اضافہ سے جسم کو آراستہ اور خوشنما بنانے پر مجبور کرتی ہے۔ اور یہ جذبہ تزئین دنیا میں کسقدر نمایاں ہے جسکی وجہ سے ہم صرف وہی وضع لباس استعمال کرتے ہیں جو ہمارے جسم کو خوشنما بناتی یا خوشنما بنانے والی فرض کی جاتی ہے۔
علاوہ اسکے اشیائے تزئین اُس زمانے میں دولت تھیں اور انکے لیے حفاظت کی

بہترین جگہہ خود مالک کا جسم تھا۔ یورپ کے قدیم ترین سکے صرف دھاتوں کے حلقے ہیں جو انگشتریوں کی طرح استعمال کئے جاتے تھے۔ امتیاز وعزت کیلئے علاوہ لباس وزیورات کے کانوں اور انگلیوں میں سوراخ کئے جاتے تھے دانت گھس دیئے جاتے تھے اور سر کے بال مخصوص وضع کے مطابق باندھے جاتے تھے۔
ملک کے بعض حصوں میں مخصوص پیداوارین بکثرت پیدا ہوتی ہیں اور تجارت ابتداً اس پیداوار کی غیر ضروری مقدار کے تبادلے سے ہوئی تجارت نے قبائل کی عزلت پسندی اور تنگ نظری کو بہت کچھ رفع کیا۔ بعض اوقات جب اک اعلیٰ تہذیب کو کسی وحشی قوم سے بذریعہ تجارت معاملت ہوئی تو وہ وحشی قوم بتدریج اس مہذب قوم میں تحلیل ہو گئی۔

آریائی اور سامی اقوام | آریائی اور سامی اقوام دنیا کے اک عظیم حصہ پر آباد ہیں اور ان کے ابتدائی حالات یہاں پر لکھنا بیجا نہ ہوگا۔ ایشیا اور یورپ کے کئی حصوں کو آریائی اقوام کے اولین قبائل کا گہوارہ ہونے کا دعویٰ ہے اور ان قبائل کے مسکن کی طرح اس بات کا بھی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کس زمانے میں منتشر ہونے لگے۔ البتہ فلالوجی کے مقابلوں سے یہ ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ آریائی اقوام کی آٹھ شاخیں ہیں:-

(۱)۔ ہندی (ہندوستان)
(۲) ایرانی (ایران)
(۳) ارمنی (آرمینیہ)
(۴) بالٹک اور سلاوی (روس وغیرہ)
(۵) ٹیوٹنی (جرمنی انگلستان۔ آسٹریا وغیرہ)
(۶) اطالوی۔ (اطالیہ)
(۷) کیلٹی (ہسپانیہ فرانس ویلس)
(۸) ہیلینی (یونان)

فلالوجی کی مدد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آریائی قبائل میں مویشی پالنے کا عام رواج تھا۔

اور یہی اون کی دولت تھی۔ اس کے علاوہ ان کو گاڑیوں کا استعمال آتا تھا۔ اور ہر خانہ بدوش
خاندان اپنا اسباب گاڑیوں پر اپنے ساتھ لئے پھرتا تھا۔ وہ عموماً فطرت کے مظاہر کی پرستش
کرتے تھے۔ اور انسانی قربانیاں ان کے ہاں جائز تھی۔

اسی زمانے میں جب آریائی یہ معمولی درجہ کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ دجلہ اور فرات کی
وادیوں میں ایک تورانی قبیلہ (اکادی) آباد تھا جسے سامیوں نے فتح کر لیا تھا اس مفتوحہ
قبیلہ کی تہذیب کو جو نہایت ترقی یافتہ تھی۔ پہلے اہل بابل نے حاصل کیا اور بعد کو اشوریوں۔
فینیشیون اور بنی اسرائیل نے اہل بابل سے یہ تمدن سیکھا اور اسے ترقی دی۔ غرض جب
آریائی لوگ تہذیب کی ابتدائی منازل میں تھے۔ سامیوں نے تمدن کے کئی اعلیٰ مراتب طے
کر لئے تھے۔ اور یہی تہذیب تھی جو آریائی اقوام نے سامیوں سے سیکھی اور یورپ میں رائج ہوئی۔

سامی نہایت وسیع پیمانے پر زراعت کرتے تھے اور انہوں نے عراق عرب کی جہاں
پہلے بہت دلدل تھی۔ نہروں کے ذریعہ سے غیر ضروری رطوبت دور کی۔ وہ پکی ہوئی اینٹوں کے
مکان بناتے تھے اور انہوں نے فن تحریر ایجاد کر لیا تھا۔ جس کے ذریعہ سے وہ اہم علمی اکتشافات
محفوظ رکھتے تھے۔ پیمانوں اور اوزان کا اک مستقل نظام قائم کر لیا تھا اور ہیئت کی مدد سے وہ
جہاز رانی کرتے تھے اور انھوں نے بڑے بڑے شہر بنا لئے تھے۔

ایشیا کی آریائی اقوام نے یہ تہذیب بلا واسطہ اہل بابل سے حاصل کی لیکن یورپ کے
آریائیوں نے فینیشیون سے سیکھی جنہوں نے کارتھیج میں ایک تجارتی صدر مقام قائم کیا تھا
جو بعد کو عظیم الشان سلطنت بن گیا۔

غرض یونان سب سے پہلے خواب بربریت سے بیدار ہوا اور بعد علی الترتیب اطالوی کیلٹی
جرمنی اور سلاوی اقوام مشرقی تہذیب سے فیضیاب ہوئیں۔

یہ ہے اک سرسری سا قیاس کائنات اور انسان کے غیر تاریخی ماضی کے متعلق اور ہر قیاس کا
مکمل طور پر صحیح ثابت ہونا لازم نہیں بہت کم لوگ ہیں جو اس نامحدود عرصہ زمان و مکان پر غور کرتے ہیں۔

وقت کے ریگستان میں سال اور صدی کنکر اور پتھر سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے اور کائنات کے خلا میں ایک سیارہ ایک سالمے سے زیادہ ناچیز ہے۔ کائنات صرف ہماری زمین یا ہمارے نظام شمسی ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں اک نامعلوم اور غیر متناہی تعداد ایسے نظاموں کی ہے جنکے ایک سیارہ کے مقابلے میں ہمارا کل نظام شمسی کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اور پھر غور فرمائیے کہ صرف ہماری زمین میں انسان اور نظر آنے والے جانور ہی نہیں آباد ہیں بلکہ ایک غیر مرئی آبادی ان ذی حیات مخلوقات کی موجود ہے جن کے مقابلے میں انسانی آبادی کی تعداد ایک بے حقیقت چیز ہے۔ وہ کونسا مکعب گز ہے جس میں اوسط کے لحاظ سے کئی سو افراد اس مخلوق کے موجود نہ ہوں؟

ہزاروں نسلیں انسانوں کی زمین پر پیدا ہوئیں اور فنا ہو گئیں لیکن اسکے پہاڑ اسی طرح استوار کھڑے ہوئے ہیں اور اسکی گردش اسی طرح جاری ہے اب آپ اپنے سے سوال کیجئے کہ

انسان کیا ہے؟

ایک بے حقیقت سیارے پر صرف تھوڑے روز رہنے والی ایک ہستی۔ اندھیری رات میں سمندر پر ایک موج پیدا ہوتی ہے اور زائل ہو جاتی ہے کیا انسان کے وجود کی اہمیت اور اسکے شہود کی فرصت اس سے زیادہ ہے؟

محمد میر خاں

غزل

کیا کاروانِ ہستی گذرا رواروی میں / فردا کو میں نے دیکھا گرد و غبار ہی میں

لائی حیات تک کو سیلِ فنا بہا کر / ایک آہ کھینچنے کو اک دم کی زندگی میں

یارانِ بزمِ عشرت ڈھونڈوں کہاں میں تمکو / تاروں کی چھاؤں میں یا پچھلی کی چاندنی میں

ہم کس شمار میں تھے پرسش جو ہم سے ہوتی / یہ امتیاز پایا آشوبِ آگہی میں

حائل ہیں اک نفس ہے محشر میں اور ہم میں / پردہ حباب سا ہے فردا میں اور ابھی میں

ہر عقدہ میں جہاں کے پوشیدہ ہے کشاکش / ہے موجِ خندۂ گل پنہاں کلی کلی میں

وجد آگیا فلک کو غش آگیا زمین کو / دو طرح کے اثر تھے اک صوتِ سرمدی میں

زخموں میں خود چمک ہے
اور اس پہ یہ ستم ہے
محشر کی آفتوں کا
دھڑکا نہیں ذرا اب
پیری میں بیت کے آ دن
امید یہ نہ رکھنا
پہلو میں تو ہو اے دل
پھر حسرتیں ہزاروں
سجدہ کا حکم مجھکو
تو نے تو اب دیا ہے
کہنا جو دل کا ماننا
اے نظم یہ نہ جانا

رنگ پریدہ سے میں
رہتا ہوں چاندنی میں
سو حشر میں نے دیکھے
دو دن کی زندگی میں
کوسوں نکل گیا ہوں
صحرائے بیخودی میں
کس بات کی کمی ہے
تیری سلامتی میں
پہلے ہی لکھ چکا ہوں
میں خط بندگی میں
جی کا زیاں دھرا ہے
ناداں کی دوستی میں

انہدام ہیئت اجتماعیہ کی ضرورت

نواب حیدر نواز جنگ
طباطبائی

اگر ہمارے اسلاف کی ارواح کو دنیائے آب و گل کی تفریح اور سیر کا ایکمرتبہ اور صرف ایک روز کے لئے موقع دیا جائے کہ وہ اپنے "سُعید" قوی اور توانا اخلاف کے شاندار "ارتقاء" کا نظارہ کریں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پھر کبھی دنیا میں آنیکی تمنا نہ کریں۔ اور نہ اس بات کو پسند کرینگے کہ اس ضعیف کم زور حقیر و ناتوان پژمردہ و زندہ درگور مخلوق کو ان سے منسوب کیا جائے اگر انحطاط قوی مادی و روحانی کی رفتار اسی سرعت کیساتھ قائم رہی تو پھر وہ زمانہ بھی دور نہیں کہ ہم بھی فنا ہو جانے کے بعد اپنی نسل کو دیکھ کر پشیماں ہوں۔ اور پھر ایک دو نسلوں کے بعد وہ "عہد زریں" آئیگا جبکہ کسی اجنبی ملک کا سیاح ہماری سرزمین کے بارہ میں یہ عجیب مگر دلچسپ عبارت لکھیگا۔

"ہندوستان (جنوبی؟) میں میں نے عجیب و غریب انسان دیکھے جنکا قد چھ انچ کا تھا۔ انکے اخلاق و عادات بھی عجیب و غریب وضع کے

پائے گئے میرا ارادہ ہوا کہ ابنائے وطن کے تفنن طبع کی خاطر دو چار "آدمی" لے آؤں مگر وہ اس قدر نازک اور نحیف و زار تھے کہ سفر کی تاب نہ لا سکتے۔ تاہم میں اُنکی تصویریں اپنے ساتھ لیتا آیا ہوں۔ ملاحظہ ہو صفحہ وغیرہ۔

گمان غالب ہے کہ وہ تصویریں۔ للی پٹ کے باشندوں سے مشابہ ہونگی جنکو آپ گلیور کے سفرنامے میں دیکھتے ہیں اور بے اختیار ہنستے ہیں۔

اسکو مبالغہ آمیز پیشین گوئی جانکر قہقہے لگائیے۔ یا سراپا کذب و ہذیان سمجھکر اظہار تنفر اور ہدف ملامت بنائیے اسکو ملا دیجئے۔ یا تلف کر دیجئے یا اسکے لکھنے والے کو ہئیت اجتماعیہ کی معزز رکنیت سے مردود کر دیجئے۔ جو چاہے کیجئے۔ جیسے کہ آپنے ابھی تک کیا ہے۔ مگر اسکی صداقت پر بھی ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے جائیے تو منفعت سے خالی نہ ہوگا۔

کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ قوی اور توانا والدین کی اولاد صحیح اور تندرست ہوگی کیا آپ کو اس امر کی حقیقت میں بھی شبہ ہے کہ آپ کی صحت اور تندرستی پر آئندہ نسلونکی صحت "قوت" اور فلاح و بہبودی کا دار و مدار ہے۔ کیا آپ اسباب کی اصلیت کو افسانہ سمجھتے ہیں کہ قوم کی ترقی اور سربلندی اسکی صحت و قوت کی رہین منت ہے؟ کیا آپ اس دلیل کو رد کر سکتے ہیں کہ عملی دنیا میں سرمشق اقوام ہونے کے لئے قوائے جسمانی کے مضبوط ہونیکی ضرورت ہے تو پھر یہ کیا قیامت ہے کہ آپ نے ایسے مکروہات کو جزو زندگی کر لیا ہے جو آپکی صحت اور قوت جسمانی کو چپ چپکے تحلیل اور بالآخر فنا کرنے والے مہلک ترین دشمن ہیں۔ آپکا غیر محسوس اور اندیشناک استیصال ہو رہا ہے۔ مگر آپ کو خبر نہیں۔ آپ چپکے چپکے "چراغان شب مہتاب" کی طرح جل رہے ہیں۔ مگر آپکو اس سوز دروں کا کوئی علم نہیں ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپنے اسلیئے ان بیہودہ اعمال کو اپنے روزمرہ کے فرائض اور واجبات میں داخل کر لیا ہے۔ کہ ہئیت اجتماعیہ یا سوسائیٹی (جو نام نہاد) کے تمام اعضاء ان پر کاربند ہیں اور ارکان ہئیت اجتماعیہ میں

آپ کے والدین بھی ہیں۔ اور آپ کے خویش و اقارب بھی آپ کے ہمسایہ بھی ہیں اور آپ کے
دوست احباب بھی۔ یہ سچ ہے مگر کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ سب کورانہ تقلید میں جادہ حق
اور صداقت سے دور جا پڑے ہیں۔ کیا آپ اسکو محسوس نہیں کرتے کہ یہ شاہراہ عام ایک
پُر خطر سیاہ اور بھیانک غار کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے
کہ ملت کا حقیقی دوست اور بہی خواہ وہی ہے۔ جو بیہودہ رسوم و رواج کو شکست کر دے جو قدیم
اوہام و ابطال کو پارہ پارہ کر دے جو سوسائیٹی کو لغویات اور تمام امراض جسمانی اور روحانی سے
پاک کر دے۔ مگر اس کے لئے اخلاقی جرأت اور پامردی ثبات اور عزم صمیم کی بے انتہا ضرورت ہے اگر
اگر آپ اپنے آپ میں اس زبردست اجتہاد کا مادہ مفقود پاتے ہیں تو کیا آپ میں اس قدر
اخلاقی جرأت بھی نہیں ہے کہ کم از کم آپ بذات خود ان "جرائم اخلاقی" سے اپنے دامن کو
غیر ملوث اور منزہ رکھیں۔ ممکن ہے کہ آپ ایسا کرنے میں بجائے خود ایک اعلیٰ اجتہاد صاحب
ہو جائیں۔ ممکن ہے کہ آپ دوسرے راہ گم کردوں کے لئے چراغ ہدایت ثابت ہوں
کیا آپ اس نتیجہ پر نہیں پہونچ سکے کہ اس قدر اخلاقی جرأت کے فقدان کے معنی تو خودکشی ہیں۔

آپ سونے سے پہلے اپنے دن بھر کے کاموں کا محاسبہ کیجئے اور دیکھئے کہ آپ کی فہرست
میں کوئی ایسا کام بھی نکل سکتا ہے جسکو واقعی طور پر اور حقیقی معنوں میں "احسن و نیک" کہا جا سکے
آپ یہ کہیں گے کہ ایسے بھی لوگ ہیں۔ جنکے لائحہ عمل میں۔ قبیح افعال اور زشت کردار کا سراغ نہیں
مل سکتا اول تو سوسائیٹی کی موجودہ حالت کا نظارہ کرتے ہوئے یہ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے اور
اگر یہ تسلیم ہی کر لیا جائے تو آپ مستثنیات سے کس طرح استناد کر سکتے ہیں۔ آپ دیکھئے پوری فضا
اور تمام ماحول۔ ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ہر فرد سوسائیٹی کے بنائے ہوئے فرائض پر عمل پیرا
نظر آتا ہے اور یہ فرائض بالکل لغو بیہودہ اور سرتاسر رکیک ہو چکے ہیں۔ اس عالمگیر نقص کی ذمہ دار
نہ سوسائیٹی ہو سکتی ہے نہ وہ افراد ہئیت اجتماعیہ جو اس کے طلسم اور نیرنگ میں گرفتار ہیں۔ اور جو
جہل مرکب کے اسیر۔ اس میں آپکا بھی کوئی قصور نہیں کہ موجودہ سوسائیٹی منافقت ' ریا ' جہل نمایش

خودغرضی۔ تن آسانی۔ عیش پرستی۔ کذب۔ غلامانہ تملق اور چاپلوسی کے آئین کا مجموعہ ہے
یہ تو زمانہ کا دستور ہے۔ جو صدیوں اور قرنوں سے اسی نہج پر جاری ہے کہ جب کسی ہئیت
اجتماعیہ کی عمارت۔ رخنوں اور داخلی نقائص کی وجہ سے متزلزل ہو جاتی ہے اور جب اسکے
ارکان میں ضعف اور پستی کے آثار رونما ہو جاتے ہیں تو ماہران فن اسکو ڈھا دیتے ہیں اور اسکی
جگہہ پر ایک مضبوط پختہ اور مستحکم عمارت کی بنائیں ڈالتے ہیں۔ نئی عمارت ڈھالنے والوں کی بھی
مرہون منت ہوتی ہے۔ اور بنانے والوں کی بھی تو کیا آپ کم از کم ماہران فن کا ماتہہ بھی نہ بٹائیں گے
اور وہ اس طرح ممکن ہے کہ آپ پہلے اپنے آپ کو ماہران فن کی امداد کے لایق بنائے
اگر یہ بھی ناممکن ہے تو پھر اسی مکر و فریب اور ذلت و خواری کی ناخوشگوار فضا میں رہئے۔
آپ اپنی دانست میں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم نے ابھی ابھی قدیم سوسایٹی کو مسترد کر کے ایک
جدید سوسایٹی کی بنا ڈالی ہے۔ مگر معاف کیجئے۔ یہ خام خیالی ہے۔ اگر آپ کورانہ تقلید کو جو
بجائے خود بے شمار نقائص اور ہزاروں خامیوں سے بھری ہوئی ہے۔ قابل مبارکباد خیال کرتے
ہیں تو پھر آپ کو "بوزینہ" اور گوسفند کی مقلدانہ سعی بلیغ کی داد بھی دینی چاہئے جو اس میدان
میں یقیناً آپ سے کچھہ قدم آگے ہی ہیں۔ ایک گوسفند اپنے پیشرو کی پیروی میں جس جرات
اور صداقت سے کنواں۔ کھائی۔ ندی۔ نالے کی پروا کئے بغیر جست لگا جاتا ہے وہ بھی تو
قابل ستایش و آفرین ہے۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا نام ہئیت اجتماعیہ کی تعمیر جدید ہے۔
کیا آپ ایک صحیح دماغ اور تندرست جسم کے مالک ہیں۔ نہیں۔ کیا آپ کے دست و بازو
میں اسقدر قوت عمل موجود ہے کہ آپ اسکی عمدہ اور کامیاب نمایش کر سکیں۔ نہیں۔ کیا آپ
مسلسل دو ساعت بغیر احساس دوران سر کے کوئی دماغی کام کر سکتے ہیں۔ نہیں۔ کیا آپ ناگزیر
حادثوں کے مواقع پر حفاظت خود اختیاری کے قابل ہیں۔ نہیں۔ کیا آپ اپنی زبان میں ایک
اوسط درجہ کا عمدہ مضمون لکھہ سکتے ہیں۔ نہیں۔ کیا آپ تین پڑھے لکھے اور چہہ جاہل اور
ناخواندہ اشخاص کے روبرو ایک مسلسل اور مربوط تقریر صرف دس منٹ تک کر سکتے ہیں۔

آپ اپنے مذہب کی تاریخی منفعت اور اسکی صحیح عظمت سے با خبر ہیں؟ نہیں۔ اگر آپ لا مذہب ہیں تو ملاحدہ کے مشاہیر اور انکی معرکتہ الآرا تصانیف اور انکے باہمی نفاق سے با خبر ہیں؟ نہیں۔ کیا آپ خود اس باب میں اپنی ذاتی رائے دیتے ہیں (جہل اور ہٹ دہرمی کے سوا) نہیں۔ کیا آپ کی خانگی زندگی میں آپ کے تعلقات اور اعضائے خاندان سے خوشگوار ہیں؟ نہیں۔ کیا آپکی زندگی قرض کی فرسا مصیبت سے آزاد ہے نہیں کیا آپکا خرچ آپکی آمدنی سے کم ہے نہیں۔ کیا آپ میں جذبۂ حب وطن وابنائے وطن ہے نہیں۔ کیا آپ الکوہل اور شراب کے استعمال سے محترز ہیں۔ کیا آپ نکوٹین اور تمبا کو کی زلف کے اسیر ہونیکے منکر ہیں۔ کیا آپ جوے کو برا سمجھتے ہیں؟ کیا آپ مختلف اقسام کے متعدد امراض سے پاک ہیں۔ کیا آپ نمایش تکلف آرایش اور نسائیت کے ناز آفریں انداز سے بری ہیں؟

کیا انہیں عادات اور خصائل۔ کیا اسی شعار اور روش کا نام ہیئت اجتماعیہ کی تعمیر جدید ہے؟ تو پھر کیوں آپ ایسی سوسائیٹی کو منہدم اور مستاصل نہیں کر دیتے جو آپکی انسانیت کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے؟ (اسقدر جرأت نہیں (!!!)

طاہر علی خان تسلیم۔

چشم عبرت دیکھ رنگ بیکسی چھایا ہوا
کھو کے مجبور چرخ سے گہوارۂ ناز و نعیم
روح ہے خاک چمن کی لب پہ یہ آئی ہوئی
یہ دل افسردۂ عشاق شور انگیز ہے

خاک پر غنچہ پڑا ہے آہ مرجھایا ہوا
خاک پر سوتا ہو جیسے کوئی ننھا سا یتیم
یا تمنا ہے دل گلشن کی مرجھائی ہوئی
یا چمن کی مختصر سی نظم درد آمیز ہے

محفلِ گلزار میں اک درد کا پہلو ہے یہہ
دیدۂ گلشن سے یا ٹپکا ہوا آنسو ہے یہہ

یہہ گرہ ہے دل کی جس سے روح ہو نزار و زار
یا کسی بیمار دوشیزہ کی چشمِ سوگوار

یہہ کسی کے کان کا موتی ہے لیکن چور ہے
یا نسیمِ عہدِ گل کی سعیِ نامشکور ہے

یہہ شگوفہ "آہ" ہکر آیا ہوا گلزار کا
آئینہ ہے زندگی کے سیکڑوں اسرار کا

ابنِ آدم! کھول آنکھیں دیکھہ عالِ جہان
ذرّہ ذرّہ کہہ رہا ہے زندگی کی داستان

سُن رہا ہے کیوں انہیں تو نیند آنے کیلئے
یہہ فسانے تو ہیں سوتوں کو جگانے کے لئے

اہلِ غفلت کا ہمیشہ مطلبِ دل فوت ہے
فکر کی قندیل کا خاموش رہنا موت ہے

عالمِ فانی کی رگ رگ میں اترنا چاہئے
خاک کے پتلے! تجھے کچھہ غور کرنا چاہئے

(۱)

اُس زمانہ میں جبکہ اسلام گہوارۂ طفولیت میں نشو نما پا رہا تہا۔ کوفہ، بغداد، بصرہ، قرطبہ اور قیروان اپنی چند روزہ ثروت و دولت کی تیز اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی روشنی سے جگمگا اُٹھے تھے اس وقت علوم و فنون کا دریا ان تمام شہروں کو سیراب کر رہا تھا لیکن فی زمانا قاہرہ ہی اس سرچشمہ سے فیضیاب ہو رہا ہے" یہ عبارت ابن خلدون نے تیرھویں صدی عیسوی میں لکھی تھی۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اسکا کہا آج بھی ایسا ہی حقیقت نما ہے جیسا سات سو سال پہلے تھا۔ زمانہ موجودہ میں جامعہ الازہر ہی ایسی مسجد ہے جہاں تعلیم بھی دیجاتی ہے مدت مدید قاہرہ کی یہہ مشہور درسگاہ اپنے کام میں پوری پوری کوشاں رہی ہے فتح مصر کے بعد عربوں نے اپنے دارالسلطنت میں ایک بڑی مسجد (جامع عمر) تعمیر کی جہاں مومنین اپنے مالک کے سامنے

سر جھکانے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ عربوں کی عدل پرستی، رعایات حقوق اور عمدہ نظام مملکت سے آبادی میں روز افزوں ترقی ہونے لگی جب مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اس وقت ایک نئی مسجد کی ضرورت لاحق ہوئی۔ بنا بریں احمد ابن طولون نے ۲۶۶ھ میں شہر کی دوسری جانب ایک عالیشان عمارت تیار کی جو اب تک اسکے نام سے معنون ہے۔ اس تعمیر کے بعد صدہا مسجدیں، خانقاہیں اور مدارس بنائے گئے ابن بطوطہ عجائب الاسفار میں لکھتا ہے۔ کہ قاہرہ میں مسجدیں اور خانقاہیں لاتعداد ہیں کیونکہ ہر امیر قاہرہ کی یہی خواہش رہی کہ ایسی عمارتوں کی تعمیر میں دوسرے سے کہیں بڑھ چڑھ کر رہے۔ کالجوں۔ اور مدارس کی تعداد تو اتنی زیادہ ہے کہ شمار نہیں کیا جا سکتا"۔

جامعہ الازہر جو انہیں لاتعداد عمارتوں میں سے ایک تھی ۳۶۱ھ میں تعمیر کی گئی لیکن پانچ سال تک اس میں درس و تدریس کی بنیاد نہیں پڑی۔ مقریزی لکھتا ہے کہ یہ رسم بڑی دھوم دھام سے ایک مجمع کثیر کے روبرو ادا کی گئی"۔ اس زمانہ میں خلفائے فاطمی حکمراں تھے انھوں نے جامعہ الازہر کی خصوصیت سے نگہداشت کی کیونکہ یہ سنیوں کے خلاف جوان کے مذہبی اور سیاسی حریف تھے لڑائی کا مرکز بنا ہوا تھا اس لحاظ سے اس پر خاص توجہ رہی اور اس میں تمام اطراف و جوانب عالم سے فخر روزگار ہستیاں جمع کی گئیں اس طرح اس عالیشان مسجد کا ستارۂ اقبال چمکنے لگا اور دنیائے اسلام میں اس نے اپنے لئے ایک معزز و ممتاز جگہ نکال لی۔ خلیفہ العزیز باللہ ابن معز نے اس دارالعلوم کو ایک بیش بہا کتب خانہ عطا کیا اور اساتذہ کے لئے بڑے بڑے وظائف مقرر کئے۔ تاریخ اسکو اس تعلیم گاہ کا بانی مانتی ہے۔ اسکے بیٹے حاکم بامر اللہ نے باپ سے زیادہ دریا دلی سے فیاضی کی۔ اس کی اعلیٰ حوصلگی کی بدولت جامعہ میں کافی سرمایہ جمع ہو گیا۔

جب سلطان صلاح الدین نے بنی فاطمہ کے استیصال کے بعد عنانِ حکومتِ مصر اپنے ہاتھ میں لی الازہر پر ایک مدت تک تاریکی چھائی رہی۔ ایک کامل صدی تک اس مسجد میں نماز جمعہ تک، نہ پڑھی جاتی تھی جامع حاکم جو الازہر کے مقابل قاہرہ کی دوسری حد پر واقع تھی

اس وقت اسکی قدر و منزلت بڑھتی چلی گئی اور یہہ مسجد اسلامی دنیا کی ممتاز درسگاہ بن گئی۔ سنہ ۱۲۶۸ء تک الازہر کو پھر دار العلوم بننا نصیب نہ ہوا۔

اس سنہ میں اس جامعہ نے دوبارہ زندگی حاصل کی لیکن اب یہہ تعلیمگاہ شیعون کا مرکز نہ تھی بلکہ اس پر سنیّوں کا تسلط ہو چکا تہا۔ سنیون کے چارون فرقون کے لایق علما فضلا یہاں جمع ہونے لگے انکی سعی و کوشش سے اس عالیشان مسجد نے اپنی گذشتہ رفعت و عظمت حاصل کر لی اور اسلام کی تلقین و اشاعت میں پیش از پیش سرگرمی دکھانے لگی۔ اس طرح از سر نو قایم ہونے کے بعد الازہر کئی سال تک اقبالمندی اور کامیابی کی حالت میں رہی اسکی ثروت و دولت، جاہ و حشمت، اور شہرت و ناموری میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ سلاطین اور امرا نے اسکی فلاح و بہبود میں بہت کچھہ فیاضان دکھائین۔ ان میں ہمیشہ رقابت رہتی تھی اور ہر ایک دوسرے سے زیادہ اس جامع کو نفع پہونچانیکی کوشش میں تلا رہتا تہا۔ اسکے ثبوت میں ایک ہی مثال درج کرنی کافی ہے۔ سنہ ۱۳۰۲ء میں ایک ہنگامہ خیز زلزلہ نے قاہرہ کی بہت سی مشہور عمارتیں منہدم کر دیں امرا اور اکابرین سلطنت نے ایک انجمن منعقد کی اور ان عمارات کی مرمت اپنے ذمہ لی۔ جامعہ الازہر کی ترمیم سالار کے سپرد کیگئی جو اس انجمن کا ایک رکن تھا۔ سالار کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے اس خدمت کو تمغۂ امتیاز خیال کیا اور اپنے ادائے فرض میں سرگرمی اور فیاضی سے کام لیا۔

جون جون زمانہ گذرتا گیا مساجد قاہرہ یکے بعد دیگرے صفحۂ ہستی سے مٹتی گئین انکی قدر و منزلت حباب کی طرح الازہر کی شہرت و اقبالمندی کے سیلاب عظیم میں فنا ہو گئی۔ اسطرح قاہرہ کی ساری علمی زندگی ایک مرکز پر مجتمع ہو گئی اور جامعہ کی سیاسی قوت معراج کمال تک پہنچ گئی۔ اسکے شیخ سلطنت کے زبردست ارکان بن گئے یہہ ذی اقتدار اور بزرگ افراد مملکت کے سیاسی اور معاشرتی امور میں بھی کافی حصہ لینے لگے۔ وہ ایک قانون جاری کرتے اور اپنی متحدہ کوششوں سے اسے کامیاب اور با اثر بناتے۔ یہی اس انقلاب عظیم کے روح

رواں تھے جس نے ۱۵۱۷ء میں قانصو الغوری کو سلطان مصر بنا دیا۔ ۲۲۔ جولائی ۱۷۹۸ء میں جب نپولین اعظم قاہرہ میں داخل ہوا سلطنت کے تمام ذی اقتدار امراء فرار ہو گئے اس وقت امیر جامعہ الازہر نے کمال جرات و دانشمندی سے فرانسیسی فاتح سے خط و کتابت کی اور تمام معاملات بہ وجوہ احسن قرار پا گئے ۱۸۰۵ء میں الازہر کی وجہ سے ایک اور سیاسی انقلاب ظہور پذیر ہوا۔ اسنے عمر ملرم کو تخت سے اتار کر محمد علی کو بادشاہ مصر بنا دیا۔ لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا اسکی تیز روشنی دھندلی پڑ گئی اور اسکی ٹھوس طاقت زائل ہو گئی۔ آج اس بات کا ثبوت بہی ملنا دشوار ہے کہ ایک زمانہ میں اس جامعہ نے بڑے بڑے کارنمایاں کئے تہے۔ وہ ہاتھ جو غیر معمولی قوت سے کام کیا کرتا تھا اب سست اور بیکار پڑ گیا ہے تاہم یہہ ابتک اس قابل ہے کہ موقع ملنے پر سخت جدوجہد سے اپنی گم کردہ قوت و اقتدار کا اعادہ کرے۔

(۲)

گو الازہر سچی دنیا کی سب سے زیادہ واجب التعظیم یونیورسٹی سے کئی سال پہلے قائم ہوئی لیکن اس سے یہہ نتیجہ نہ نکال لینا چاہئے کہ فاتح افواج المسلمین کی آمد کے ساتہہ ہی مساجد تعلیمی کی افتتاح ہونے لگی بلکہ برعکس اسلام کے اقصائے عالم میں پہیل جانے کے ایک عرصہ کے بعد اسلامی تعلیم گاہیں وجود میں آئیں حضرت رسالت مآب صلعم کے ابتدائی جانشین نئی مملکت کے نظم و نسق کے سخت کام میں اس قدر منہمک رہے کہ انکو تعلیمی آراستگیوں کی طرف توجہ مبذول کرنے کا کافی موقعہ نہ ملا۔ سادگی انکے مذہب کا جزو اصلی تہا۔ تلقین توحید اور تبلیغ رسالت انکا مقصد اعلیٰ رہا۔ انکے دقایق سے ناآشنا دماغ مذہبی موشگافیوں کی بالکل پروانہ کرتے تہے وہ سپاہی تہے نہ کہ الوہیت کے عالم۔ خانقاہیں اور جامعات بعد کی صدیوں کی پیداوار تہیں۔ یہ تعلیم گاہیں پہلے پہلے صرف عبادت خانے تھے جہاں شایقین علم اپنے ہم مذاق علماء سے ملتے اور ان سے مباحثہ مناظرہ کیا کرتے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اصحاب علم اپنے علوم کی اشاعت کیلئے بکثرت جمع ہوتے گئے اور آہستہ آہستہ اور لوگ بہی انکے سرچشمہ دانش سے

فیضیاب ہونے کے لئے داخل ہونے لگے لیکن اس سے پہلے کہ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے مفوضہ کام کے لئے ایک باقاعدہ تعلیمی اسٹاف مرتب ہو کئی سال گذر گئے ۔

اکثر عربی مورخین کا خیال ہے کہ نوجوانوں کی تعلیم کے لئے پہلا مرتب مدرسہ نظام الملک طوسی نے تقریباً سنہ ۱۰۶۶ء میں دارالسلطنت بغداد میں قایم کیا۔ اس زمانے کے روشن دماغ منتخب علما نے ایک مجلس احتجاج کا ایک درس گاہ بن جانے کو نہایت سخت جرم جانا لکھا گیا ہے کہ جب علمائے ماوراء النہر نے سنا کہ اس قسم کی مجلس قایم ہوئی ہے تو ان پر سکتہ کی سی حالت طاری ہو گئی۔

حاجی خلیفہ ان کا قول اس طرح نقل کرتا ہے "علوم و فنون بزرگ اور دنیاوی تعلقات سے بے نیاز دماغوں کا حصہ ہے جو دولت علم کو ہی اپنا پورا معاوضہ سمجھنے کے لئے مستعد ہوں۔ اب چونکہ اس کام کی اجرت دیجائیگی ذلیل اور ادنی دماغ منافع کے خیال سے اس پیشہ کی طرف رجوع ہونگے۔ ایسے لوگ اپنا مرتبہ بڑھانے کے بجائے خود علم کی منزلت گھٹا دینگے۔ طبابت کو ہی دیکھو۔ یہہ علم عہد انبیا سے چلا آرہا ہے۔ مگر جوں ہی یہودیوں نے اسکو اختیار کیا اسکی ساری عظمت گم ہو گئی اور پھر بھی انکی خساست حسب سابق قایم ہے"!

ٹھیک طور سے یہہ بتانا مشکل ہے کہ الازہر انجمن احتجاج سے مدرسہ کب بن گئی۔ غالباً عہد صلاح الدین سے پہلے یہہ تعلیمی مسجد ... نے جامع بغداد کی پیروی کی اور درسگاہ کا قالب اختیار کرلیا۔ تاہم اسکا ابتدائی اثر اب تک باقی ہے۔ آج تک یہہ ایک ایسی مجلس کی طرح قایم ہے جو اسلامی خیالات و روایات کی تائید اور اسلامی اصول کی تبلیغ میں کوشاں ہے وہ مشاہیر اسلام جو راسخ الاعتقادی کے مرکز اور مذہب اسلام کی روح مجسم مانے جاتے ہیں اس شجر کے اثمار ہیں۔ اس بات کی توضیح کے لئے کہ یہہ عالم ہستیاں ابتدائی اسلامی تمدن کے اوتار کیوں مانی جاتی ہیں چند اصولِ اسلامی پر کم سے کم ایک تیز اور اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنی ناگزیر ہے۔

(۲)

مسیحیت کے خلاف اسلام میں رہبانیت کا عنصر مفقود ہے یہہ ایک دنیا داروں کا مذہب ہے

دنیاداروں نے دنیاداروں کے لئے اس کی اشاعت کی۔ تاہم باوجود اس سادگی کے اکثر مسائل میں یہہ ایک نہایت ہی پیچیدہ مذہب ہے یہہ ایک عمدہ دینی اصول ایک اعلیٰ دنیاوی قانون اور ایک بے نظیر اخلاقی معلم ہے جو انسان کے ادنیٰ ترین اشغال اور زندگی کے بغایت گہرے تعلقات کے دقیق ترین مسائل کی وضاحت کرتا ہے۔

قرآن شریف صرف اسلامی انجیل ہی نہیں بلکہ یہہ اساس قانون بھی ہے۔ رسول کریم کے احادیث (اثر وخبر) ہی عام قانون بن گئے جس کا نفاذ عموماً ہر دار القضات میں ہوتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ اسلام میں پادری نہیں تاہم اس میں دینی علما ہیں۔ اسکی ہر چیز خدا کے حکم اور حضرت محمد صلعم کی ذات سے وابستہ ہے اسی وجہہ سے۔ مذہب اور قانون اسلامی تہذیب کے محور ہیں۔

ایسے انہماک طلب کام میں سرسری طور سے کمال حاصل نہیں کیا جاسکتا اسکی تحصیل کے لئے سخت کوشش بے پایاں مصروفیت اور عمدہ تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے الازہر اور دوسرے اسلامی مدارس اپنی لا انتہا جانفشانیاں اسی کام کے نذر کرچکے ہیں جو افراد ان درسگاہوں کے دروازوں سے باہر نکلتے ہیں مذہبی علم و فضل کے مخزن اسلامی اخلاق کے معدن اور مسلم معتقدات کے بے نظیر محافظ ہوتے ہیں۔ وہ عنان سلطنت ہاتھہ میں لیتے نہ افواج پر حکمرانی کرتے اور نہ تدبیر وسیاست کی پرپیچ کارروائیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ گو یہہ قوتیں انکے ہاتھہ میں دی جاسکتی ہیں۔ مگر ان کی عملداری کچھہ اور ہی ہے جسکے وہ تنہا مالک ہیں۔ انکے حقوق کو کوئی غصب نہیں کرسکتا۔ کوئی ہارون الرشید ان کے متعینہ استحقاق پر شرعاً یا قانوناً دست اندازی نہیں کرسکتا اس استحقاق کا دارومدار رہبانیت یا نفس کشی پر نہیں بلکہ امر حقیقت پر ہے کہ انکا علم وفضل اسلامی تمدن کی روح کا مرکز ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ ان میں سے اکثر افراد بے نظیر اخلاق کے نمونے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر علمائے اسلام اس قدر معزز ومقتدر

ہیں تو اس امر کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ وہ کامل الفن ہوتے تھے۔ انکا دائرہ علم اتنا ہی وسیع ہوتا تھا جتنی ان کی بالغ نظری وہ ہر علم و ادب کو جو اسلام سے ذرا سا بھی تعلق رکھتا ہو نہایت ہی غور و توجہ سے پڑھتے اور اس میں کمال حاصل کرنیکی کوشش کرتے۔

یوں تو اسلامی دنیا میں سینکڑوں ایسی عمارتیں ہیں جو دورِ گزشتہ کی عظمت و سطوت کی بے نظیر یادگاریں ہیں لیکن یہہ خصوصیت الازہر ہی سے وابستہ ہے کہ وہ تمدنِ قدیم کا ایک فقید المثال نمونہ ہے۔ دورِ حاضر کے ارتقاء تغیر و تبدل اور انقلاب سے وہ ایسی ہی مادری ہے جیسی ہزار سال پہلے تھی۔ اگر اب ہم اس جامعہ کی سیر کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دسویں صدی کی الازہر کو دیکھ رہے ہیں سب سے زیادہ جرأت انگیز تو یہہ امر ہے کہ اس میں ابھی اس عہد کے نصاب کی تعلیم دی جاتی ہے جبکہ مشہور اکسفورڈ یونیورسٹی وجود میں بھی نہ آئی تھی۔

(۴)

الازہر نے علوم کو دو شعبوں پر منقسم کیا ہے "علوم مقصودیہ" اور "علوم الیہ" اصولِ اخلاق دینیات، اصولِ قانون قرآن اور ایسے ہی علوم قسم اول میں داخل ہیں۔ اور صرف تعلیلاتِ نحوی، تراکیب فصاحت و بلاغت شاعری اور ابتدائی حساب قسم دوم میں۔

لیکن اس علمی عبادت خانہ کے داخلہ کے شرائط نہایت معمولی ہیں۔ خدیو مصر کا ایک فرمان مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۱۱ء جو اب تک جاری ہے حسب ذیل ہے (دفعہ ششم)۔

تمام امیدوار جو جامعہ الازہر میں داخل ہونا چاہتے ہیں مندرجہ ذیل شرائط کو پورا کریں۔

(۱) ان کی عمر دس اور سترہ سال کے درمیان ہو۔

(۲) پڑھنے لکھنے میں کافی مہارت رکھتے ہوں۔

(۳) کم سے کم نصف قرآن شریف حفظ ہو۔

(۴) تندرست و توانا ہوں۔
(۵) اگر امیدوار چہاردہ سالہ ہو تو اپنے نیک رویہ ہونیکا صداقت نامہ پیش کریں۔

یہہ ضوابط الازہر کے مسئلہ تعلیم کے تصور پر کافی روشنی ڈالتے ہیں! ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جامعہ میں ریاضی قدر و منزلت کی نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتی۔ نیز یہہ کہ علم ادب بھی چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اچھا حافظہ اور قرآن کی شریف خاصی واقفیت نہایت اہم چیزیں خیال کی جاتی ہیں۔

اسلوب تعلیم معمولی ہے۔ سبق نہایت ہی دقیق ادبی عربی کا ہوتا ہے جو ایسے تشابیہ و استعارات سے مملو ہوتی ہے کہ ناواقف کے لئے ایک پیچیدہ معمہ سے کم نہیں استاد سبق کو صاف اور شستہ با محاورہ عربی زبان میں سمجھاتا ہے لیکن وہ اپنے مضمون کو اسطرح ادا کرتا ہے گویا وہ ایک مستند قول کا اظہار ہے جس سے کذب و غلط کوسوں دور ہے اور کبھی اپنے بیان کا ثبوت دینے کی زحمت گوارا نہیں کرتا صرف سمجھا دینے کو وہ اپنا فرض منصبی خیال کرتا ہے۔ لکچر ختم ہونے پر استاد جماعت کے ہر طالب علم کو تین کی ایک ایک نقل دیتا ہے اور بہت سے طالب علم اسکو ازبر کر لیتے ہیں۔

طلباء کو گھر پر کرنے کیلئے کوئی کام نہیں دیا جاتا مگر اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے اسباق میں بیحد دلچسپی لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی معقول یا غیر معقول سوالات سے استاد کے لکچر میں داخل اندازی بھی کر بیٹھتے ہیں اکثر بہت سے ملکر تحصیل کردہ سبق کے متعلق بحث مباحثہ کیا کرتے ہیں لیکن کسی وقت اور کسی حالت میں انکو اپنے پاؤں پر آپ کھڑے رہنے کی تعلیم نہیں دیجاتی۔ انکے سامنے علم ایک طبق میں پیش کیا جاتا ہے۔ اب اس میں سے حصہ لینا اور ہضم کرنا ان کا فرض ہے۔

اس سے یہہ نتیجہ نہ نکال لینا چاہیے کہ الازہر کے پروفیسر نا قابل ہوتے ہیں

اس علم کی حد تک جو ان کے اشغال سے متعلق ہے وہ علمائے جامع کہلائے جانے کے مستحق ہیں وہ طلیقہ متوسطین سے ہوتے ہیں۔ ان کا علم قدیم غیر مروج کہنہ اور موجودہ تہذیب کے نقطۂ نظر سے غیر مفید اور کم قیمت ہے۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تکمیل کے اسکے علاوہ وہ محنتی ہیں اپنے کام میں منہمک رہتے ہیں اور اقوال سے ہی نہیں بلکہ اپنا نمونہ پیش کر کے طالبعلموں کو محنت استقلال اور قابل تعریف ثابت قدمی پر امادہ کرتے ہیں۔

(۵)

جامع الازہر کی تعمیر کی تاریخ کیلئے ہمکو قاہرہ کے عہد متوسط کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے اگرچہ یہ عمارت ۹۷۰ء میں مکمل ہو چکی تھی لیکن اتنے بار اسکی ترمیم کی گئی ہے کہ سوائے اور میانی عمارت اور اوسکی گنبد کے کسی چیز کو اس سنہ کی بنا نہیں کہہ سکتے باقی سب بعد کے زمانہ کی یادگاریں ہیں۔

نماز گاہ ہی اب تعلیم کا "ایوان خاص" بن گئی ہے اس قطعہ میں سنگ مرمر کے ۱۴۰ ستون ہیں اسکا رقبہ چار ہزار مربع گز ہے۔ عمارت کے وسط میں ایک بڑا کشادہ صحن ہے اسکے تین طرف وسیع رواق ہیں جن میں سے ہر ایک کسی غیر ملک یا مملکت مصر کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ چوتھی جانب جو مکہ کے سمت ہے مسجد ہے۔

تعلیمی اسٹاف ۱۸۰ پروفیسروں پر مشتمل ہے۔ طلبا کی تعداد جو سب سے آخری فہرست میں شائع کی گئی تھی پانچ ہزار چھ سو گیارہ ہے۔ ان کی عمروں کا تفاوت دس سے چالیس سال تک ہے۔ طالب علم تمام اسلامی دنیا سے آتے ہیں جنگ سے پہلے شاید ہی کوئی مسلم ریاست ایسی ہو گی جس کا ایک نہ ایک نمائندہ الازہر میں نہ ہو۔ جنگ اور اوسکے بعد بدامنی (جو جنگ کا لازمی نتیجہ ہے) نے اس بیرونی عنصر کے گھٹا دینے میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ اکثر مصری طلبا دہقانی ہوتے ہیں چند سال سے مصر کے امیر و شریف خاندانوں نے اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لئے اس جامعہ میں بھیجنا ترک کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ افسوسناک

یہہ امر ہے کہ الازہر کے پروفیسر اپنے لڑکوں کو اپنا جانشین بنانیکی بہت کم کوشش کرتے ہیں۔
ہتذکرہ یا لافہرست میں اُن سیکڑوں لڑکوں کی تعداد شامل نہیں ہے "جو قطب"
یا ابتدائی مدرسہ میں تعلیم پاتے ہیں یہ مدرسہ بھی جامعہ سے ملحق ہے۔ جامعہ میں میزین وغیرہ
مفقود ہیں کبھی کبھی کسی استاد کیلئے ایک آدھ کرسی نظر آجاتی ہے۔ طالب علم چٹائیوں پر
اپنے پروفیسروں کے گرد جن میں سے بہت سے اس قسم کی آرام وہ نشست کو کرسیوں پر ترجیح
دیتے ہیں۔ بیٹھے رہتے ہیں۔

ایوان مذکور میں ایک ہی وقت میں کوئی پچاس ساٹھ جماعتیں ہوتی رہتی ہیں۔
ہر ایک جماعت اپنے ہی استاد کی طرف متوجہ رہتی ہے جو عموماً آہستہ مگر صاف اور بلند
آواز میں گفتگو کرتا ہے۔

(۶)

۱۸۹۵ء تک سلاطین مصر نے الازہر کے نظم ونسق میں کوئی نمایاں حصہ نہ لیا اس سال
خدیو مصر نے ایک فرمان صادر کرکے ایک انجمن کے انعقاد کا حکم دیا۔ اس انجمن کے ارکان پانچ تھے
جنکا فرض منصبی یہہ تھا کہ اس مسجد تعلیمی کی اقبال بلندی اور کامیابی میں کوشاں رہیں۔ جولائی ۱۸۹۶ء
میں اس فرمان نے قانون کی شکل اختیار کرلی لیکن الازہر اتنی کہنہ درسگاہ ہے کہ بغیر قبولیت عامہ کے
بادشاہ کی توجہ بہت فائدہ بخش ثابت نہیں ہوسکتی۔ ۱۹۱۱ء میں ان قوانین کی پھر ترمیم وتکمیل ہوئی
تاہم اس سے جامعہ کے نصاب قدیم پر چنداں اثر نہ پڑا۔ الازہر اصل میں اب بھی ویسی ہی ہے جیسی سلطان
صلاح الدین کے عہد میں تھی اِس میں شک نہیں کہ دور جدید کی اس اصلاح وترمیم سے انتظام جامعہ میں
بہت کچھہ تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن درس تدریس کی حد تک یہہ تعلیم گاہ ہنوز اپنی قدیم سر وں میں
نو اسخ ہے۔

دار العلوم قضاۃ یا درسگاہ منصفان شرعیہ کی افتتاح بھی الازہر کے انتظام میں ایک
اور اصلاح تھی مگر وہ ایک جداگانہ محکمہ تھا۔ جامعہ کی تعلیم وتدریس کو اس سے کچھہ تعلق نہ تھا۔

دنیا کو مذہب اسلام کا بیحد مشکور ہونا چاہیے۔ آج یہہ بت پرستی کے خلاف بڑی جد وجہد سے
فتح مندانہ معرکہ آرائیوں میں مصروف ہے۔ کوئی دوسرا مذہب اشاعتِ دین کے لحاظ سے اسلام کا
ہمسر نہیں ہے۔ اس بات کا اندازہ کرنا ناممکن ہے کہ اگر مصر علمائے الازہر کی مذہبی فضیلت اور علمی
قابلیت عملی طور سے کام میں لائے تو بنی نوع انسان کو عموماً اور افریقیہ اور ایشیا کو خصوصاً کتنا
نفع پہونچیگا۔ وہ نہ صرف اپنے مذہب سے پوری طرح آگاہ ہیں بلکہ انکو عربی ادب کے صنائع بدائع انشا
وعبارت میں بھی کامل دستگاہ ہے۔ اسلئے جد وجہد کے میدان میں قدم زنی کرنی ان کیلیے نسبتاً
آسان ہے وہ نظام الاوقات جامعہ میں دخل دہی کے بغیر اتنا وقت نکال سکتے ہیں کہ علوم موجودہ سے
بھی کافی آگاہی حاصل کرلیں۔

حالتِ موجودہ میں علومِ مشرقیہ کے بہترین خیرخواہ اسکی ترقی کے راستہ میں سد باب بن گئے
ہیں وہ مشرق ومغرب کی علمی قیمت کا موازنہ کرکے مشرق سے برسرپیکار ہوگئے ہیں۔ یہہ امر
خطرناک ہے اگرچہ دورِ جدید نے قلعہ الازہر پر حملہ نہیں کیا ہے مگر وہ اوسکا محاصرہ کئے ہوئے ہے
اور اس کے پاسبانوں کو دھمکا رہا ہے لیکن بیسویں صدی اور عہدِ متوسطین کے درمیان
جنگ وجدل کی ضرورت نہیں الازہر میں اتنی وسعت ہے کہ زمانہ موجودہ کی خوبیوں کو جذب
کرلے وہ صرف "تو ابھی چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز" کی محتاج ہے۔ اور جب یہہ عنصر بھی
اس میں شامل ہوجائیگا تو اسلام میں ایک روح تازہ سرایت کرجائیگی اور دنیا میں مسرت وبہبود
کی زیادتی ہوجائیگی۔

ابوالنصر فتح اللہ (ماخوذ)
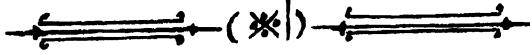
بہت وقفِ مشقت رہ چکی چاروں پہر دنیا
جو دن بھر تھک چکے ہیں اُنکو راحت کا ملا مژدہ

ہوا اب ختم وقتِ کار، دہقاں کھیت سے نکلا
اُفق پر مغربِ رنگیں کے مہرِ خستہ جا پہنچا۔

قریبِ ختم دن کی ساعتیں ہیں شام آئی ہے
عطیہ خوابِ شب کا فطرتِ مشفق سے لائی ہے

ہوئی سورج کی قوت مضمحل دن بھر کی محنت سے
ہے پیدا آرزوئے خواب و راحت چہرہ سے اسکے

جھوم آیا ہوا میں اور اب آتے نہیں جھونکے
اب اُس ذوقِ لعب اور جوش سے ہلتے نہیں پتّے

ہوئی ہے فطرۃً تفریح کی اک جستجو پیدا
ہے ذرّہ ذرّہ سے آرام کی اک آرزو پیدا

چراگاہوں سے واپس آرہے ہیں گاؤں کو راعی
اور آگے آگے ہے اک نامرتب فوج بھیڑوں کی

اُٹھا کر ہل چلا گھر کی طرف افسردہ دہقاں بھی
جھکائے گردنیں بیل اُسکے پیچھے پیچھے ہیں راہی؛

گڈریے نے وہیں سے ایک غمگیں راگ چھیڑا ہے
اور اُسکی نَے کا نغمہ پُرشکایت حسرت افزا ہے

وہ کسکا قلب ہے جس میں یہ دہقانی نوا سنکر
نہ ہو اک ٹیس پیدا اور نہ ہو محسوس اک نشتر

اُبھر آتے ہیں ناکامِ تمنا کے تخیل پر
محبت کے نقوشِ ماضیہ اور قصۂ دلبر

ہے پیدا اس سے ہوتی کوئی یادِ تلخ الفت کی
کوئی ناکامیابی اپنے رومانِ محبت کی

ذرا سی قوس اب باقی رہی مغرب میں سورج کی — چھپا جاتے ہیں پر اس کا حسنِ رنگین بھی
مگر اُن کے کنارے کر رہے ہیں صاف غمازی! — اور اب تک لمسِ رنگیں کوہ پر کرنوں کا ہے باقی

غرض ہوتا ہے غائب مہر ایسی جلوہ ریزی سے
اور اک دلہن بنا ہے آسماں اس رنگ پاشی سے

ہے غرقِ رنگ دنیائے سحاب اسوقت سر تا پا — شہابی ہے یہ ٹکڑا ابر کا یہ سُرخ، یہ نیلا
بتدریج ایک کو ہے دوسرے سے اتحاد ایسا — کہ اک رنگوں کی موسیقی ہوئی افلاک پر پیدا

نظر محوِ تماشا اور وقفِ کیفیت دل ہے
یہ دنیا تو یقیناً جا کے بس جانیکے قابل ہے

کیا گہرائیوں تک عکس نے تالاب کو رنگیں — مگر اب ختم ہوتا ہے شفق کا لمحۂ زریں
فضا ہوتی چلی ہے دھندلی سی اور رمز آگیں — صدائیں کھیل کی بچوں کے اب بالکل نہیں آتیں

کیا ملفوف رفتہ رفتہ تاریکی نے منظر کو
ہوئی اب فکر کھیتوں کے نگہبانان مضطر کو

ستارے ہیں فضائے آسماں میں اب نکل آئے — دئے بھی گاؤں میں کچھ ٹمٹماتے ہیں نظر آتے
نہیں کچھ اہلِ کلبہ کو شکایت اپنی قسمت سے — طعام بے تکلف بال بچے مل کے کھائیں گے

اور اپنے بستر سادہ پہ سوئیں گے فراغت سے
اُٹھیں گے صبح کو تجدید قوت کر کے راحت سے

نہ جانیں شہر والے انکی محنت رائیگاں یکسر — نہ تہذیب ریائی خندہ زن ہو صدقِ سادہ پر
حیاتِ سادۂ دہقاں میں مضمر ہیں سبق اکثر — گھٹے ہے احترام اہلِ دولت کی جنہیں پڑھ کر

ہے اسکی محنتوں میں روح اخلاص و صداقت کی
ہے دہقاں اسلئے نزدیک تر سرحد سے فطرت کی

(عزبت)

اجتا راج کنواری تھی۔ راجہ نارائن کے درباری شاعر نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا جب کبھی وہ اپنی کوئی نظم بادشاہ کو سناتا تو اپنی آواز کو اس قدر بلند کر دیتا کہ وہ سننے والے بھی جو بالا خانے کے برآمدہ میں مستور رہتے اسے اچھی طرح سن لیں۔ اسکے نغموں کی موجیں اس بزم انجم (انجمستان) کی طرف بہنے کی عادی تھیں۔ جہاں اسکی قسمت کا منیر ستارہ جگمگاتا رہتا لیکن وہ انجمن اسکی دسترس سے پرے اور وہ ستارہ اسکی آگاہی سے ماوریٰ تھا۔

کبھی اسے پردے کے پیچھے کوئی متحرک سایہ نظر آتا۔ کبھی اسے دور سے چھن چھن سنائی دیتی اور وہ محو ہو جاتا۔ ان نازک ٹخنوں کے تصور میں جنکے سنہری گھنگرو ہر ہر قدم پر ترنم کرتے تھے ان نرم اور ملایم قدموں کے خیال میں جو زمیں پر اس طرح خرام کرتے تھے جیسے رحمت خداوندی افتادگان خاک پر۔

ہمارے شاعر نے ان کو اپنے دل کے مقدس ترین حصہ میں جگہ دی تھی اور یہاں وہ ان سنہری گھنگروں کی موسیقی کے ساتھ ہمنوائی کرتا۔ اس بارے میں اسے کبھی شک بھی نہیں ہوا کہ کسکا سایہ پردے کے پیچھے حرکت کرتا تھا اور کسکی پازیب اسکے دل کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔

منجری راج کماری کی خواص تھی۔ اور ہر روز دربار کو جاتے ہوئے گویا باد سے ہمارے شاعر سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ جاتی۔ جب کبھی سڑک سنسان رہتی اور تاریکی دنیا پر اپنا سایہ ڈالے ہوئے رہتی وہ بے حجابی سے کمرہ میں آجاتی اور قالین کے ایک سرے پر بیٹھ جاتی۔ ایسے موقعوں پر اکثر شبہ ہوتا کہ اس نے نقاب کا رنگ اختیار کرنے اور جوڑے میں پھول لگانے

میں معمول سے زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے۔

منجری کے معنی شاخ گل کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نام کی شیرینی ہم جیسے فانی انسانوں کیلئے بہت کافی ہے۔ لیکن شنکر نے اس میں اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کردیا اور اسے شاخ گل نوبہار کا نام عطا کیا۔ ہم جیسے فانی انسان یہ سنکر سر ہلاتے اور کہنے لگتے ہیں "سبحان اللہ"۔

بہار یہ گیتوں میں شنکر شاخ گل نوبہار کی تعریف خصوصیت کے ساتھ دہرا تا رہتا۔ مہاراجہ انہیں سنکر اسکی طرف دیکھتا اور آنکھ سے ایک پر معنی اشارہ کرتا اور ہمارا شاعر جواب میں مسکرا دیتا۔ مہاراجہ اس سے پوچھ بیٹھتا۔ "کیا شہد کی مکھی کا کام صرف دربار بہار میں گنگنا تا ہے"۔ شاعر جواب دیتا۔ "نہیں بلکہ شاخ گل نوبہار کا شہد چوسنا بھی" اور سب کے سب شاہی دربار میں ہنسنے لگتے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ راج کنواری بھی اپنی خواص پر ہنسا کرتی کہ اسنے بلا عذر و حیلہ شاعر کا عطا کردہ نام قبول کر لیا اور منجری دل میں باغ باغ ہو جاتی۔

خالص حقیقتیں شاعر کے دوسرے نغموں سے مترشح ہوتی تھیں جنکے موضوع عاشق کر شناء معشوق را وصالا لازوال مرد۔ لازوال عورت ازلی رنج اور ابدی راحت ہوتے۔ ان کی حقیقت بادشاہ سے لیکر فقیر تک ہر شخص اپنے دل کی گہرائیوں میں جانچتا اور محسوس کرتا یہ گیتیں زبان زد خاص و عام تھیں۔ چاند کی ذرا سی جگمگاہٹ پر نسیم سحری کے ذرا سے خرام پر ہوا۔ رن گنت۔ نغموں سے لبریز ہو جاتی۔ یہ موجیں کبھی دریچوں سے نکلتیں کبھی آنگنوں سے کبھی کشتیوں سے اور کبھی رو کھ تلے کے سایوں سے۔

اس طرح دن مہینوں سے گذرتے رہے۔ شاعر سناتا۔ بادشاہ سنتا اور سامعین تعریفیں کرتے منجری دریا کو جاتے وقت شاعر کے کمرہ سے گذرا کرتی۔ مانوس سایہ بالاخانہ کے پردے کے پیچھے سے حرکت کرتا رہتا اور نازک سنہری گھنگرو برابر بجتے رہتے۔

اسی زمانہ میں ایک اور شاعر اپنے وطن سے کوس لمن الملک بجاتا ہوا شمال کی طرف روانہ ہوا۔ امرا پور۔ راج میں پہونچکر مہاراجہ نارائن کے پاس حاضر ہوا اور تخت شاہی کے سامنے

ادب سے کھڑا ہو کر قصیدہ مدحیہ سنایا۔ وہ تمام ممالک کے درباری شعراء سے مقابلہ کرتا ہوا آرہا تھا اور کامیابی و کامرانی کا سہرا برابر اس کے سر رہا تھا۔

بادشاہ نے اسلئے شاعر کا بہت عزت سے استقبال کیا اور کہا۔ اے شاعر ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں" لیکن پنڈرک نے بڑے گھمنڈ سے جواب دیا۔ خداوند میں جنگ کی درخواست کرتا ہوں۔

بیچارہ شکر نہیں جانتا تھا کہ شاعر کی جنگ کس طرح کیجائے۔ رات بھر اسکی پلک سے پلک نہیں لگی۔ مشہور پنڈرک کی پر رعب شکل و شباہت اسکی ستوان ناک اور ایک طرف جھکا ہوا سر رات بھر ہمارے شاعر کے خیالات میں گھومتا رہا۔ صبح شکر لرزتے ہوئے دل سے مبازرت گاہ میں داخل ہوا۔ عام مکان لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسنے مسکراتے ہوئے جھک کر اپنے حریف کو سلام کیا۔

پنڈرک نے سر کی خفیف سی حرکت سے سلام کا جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف ایک پر معنی تبسم سے دیکھا۔ شکر نے ستور بالا خانہ پر نظر کی اور اپنی مالکہ سے اپنے دل میں یوں خطاب کیا "میری معزز کنواری اگر آج کے مقابلہ میں میں فیروزمند ہو جاؤں تو تیرا طغرہ کا نام سرفراز ہو"

دہل بجنے شروع ہوئے اور حاضرین کی انبوہ عظیم نے پکارا۔ مہاراجہ کی جے"۔ مہاراجہ یہنی سفید قبا زیب بدن کئے ہوئے خریف کی ایک لکہ ابر کی طرح آہستہ آہستہ نمودار ہوا اور گدی پر متمکن ہو گیا۔

پنڈرک اٹھا (اس عظیم الشان ایوان میں سناٹا تھا) اور مہاراجہ نارایں کی مدح اپنی گرجتی آواز میں شروع کی۔ اسکا سینہ کشادہ تھا اور اوسکا سر بلند تھا۔ اسکے الفاظ ایوان دربار کی دیواروں پر بحر متلاطم کی موجوں کی طرح ٹکرا رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ متوجہ سامعین کے سینوں پر چوٹ پڑ رہی ہے۔ اس نے بڑی قابلیت اور ہنرمندی سے نارایں کے نام کو مختلف معنوں کا لباس پہنایا۔ اور اسکے ہر حرف کے متعلق ایسے صنائع بدائع سے کام لیا کہ تمام

سامعین مبہوت رہ گئے۔ اس لئے بیٹھ جانے کے کئی منٹ بعد تک بھی اس کی آواز شاہی دربار کے ان گنت ستونوں اور ہزاروں بے زبان دیوں میں گونجتی رہی۔ دور دراز ممالک سے آئے ہوئے پنڈتوں نے "آفریں صد آفریں" کے نعرے لگائے۔ مہاراجہ نے شنکر پر نگاہ ڈالی شنکر جواب میں بیچین اور رنج آلودہ نظروں سے اپنے آقا کی طرف دیکھا اور ایک زخم خوردہ ہرن کی طرح اٹھا۔ اسکا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ ایک عورت کی طرح شرما رہا تھا۔ اسکی نوجوان اور نازک موت ایک ٹوٹتے ہوئے ستارے کے مانند تھی اور ذرا سی چھیڑ دینے کی محتاج۔ اسکا سر جھکا ہوا تھا اواز بالکل دھیمی تھی۔ ابتدائی چند بند تو تقریبًا سنائی نہیں دئے۔ لیکن اسنے آہستہ سے سر اُٹھایا اور اوس کی سریلی شیریں آواز ایک شعلۂ نازک طرح آسماں کی طرف لپکی۔

اس نے زمانہ ماضی کے خانوادہ شاہی کے افسانوں سے شروع کیا اور اونکی بہادری اور عدیم النظیر سخاوت کو دور حاضر تک ثابت کرتا چلا گیا۔ اسنے مہاراجہ پر اپنی نظریں جا دین اور لامحدود اور ناقابل بیاں محبت سے جو رعایا بادشاہ سے رکھتی ہے اسکے نغمہ میں ایک عجیب تاثیر پیدا کر دی اور اسنے تخت شاہی کو ہر طرف سے اسی محبت کے ہاروں سے مزین کر دیا۔ اسنے آخری الفاظ "میرے آقا ممکن ہے کہ میں ضائع لفظی میں ہار جاوں۔ لیکن تیری چاہت میں کبھی نہیں ہار سکتا۔ او اسکے اور لڑزتا ہوا اپنی جگہہ پر بیٹھ گیا۔

تمام سامعین آبدیدہ ہو گئے اور سنگین دیواریں فتح کے نعروں سے ہلنے لگیں ان عام ہنگامہ جذبات کو پنڈرک نے ایک حقارت آمیز زہرخند اور سر کی ایک نخوت انگیز جنبش سے ٹھکرا دیا اس نے اٹھکر تمام مجلس سے اپنی زبردست آواز میں سوال کیا وہ کون سی شئے ہے جو لفظ سے برتر ہے"؟

چشم زدن میں سارا ہال خاموشی میں ڈوب گیا پھر اوس نے تقریر کرنی شروع کی اور اسکے ایک ایک جملے سے عالمانہ شان ظاہر ہو رہی تھی اس نے ثابت کیا کہ لفظ ہی کی ابتدا ہے اور وہ لفظ خدا ہے اسنے کتب دینیہ کے حوالے دئے بعد لفظ کے لئے ایک ایسا بلند ممبر

تیار کر دیا جہاں وہ دونوں عالم کی ہر چیز سے اونچا نظر آئے۔ اس نے پھر اپنے سوال کو دہرایا۔ "وہ کونسی شئے ہے جو لفظ سے برتر ہے۔ اس نے چاروں طرف فخر کی نگاہیں ڈالیں کسی کو اس کا جواب دینے کی جرأت نہ ہوئی وہ بڑے اطمینان سے اپنی جگہہ پر بیٹھ گیا۔ اس شیر کی طرح جس نے اپنے شکار کو اچھی طرح ہضم کر لیا ہو۔ تمام پنڈتوں نے آفریں صد آفریں کی صدائیں بلند کیں بادشاہ تعجب سے خاموش تھا۔ اور شنکر اپنے آپ کو اس علمی تبحر کے مقابلے میں ذرہ ہیمقدار سمجھنے لگا۔ اسدن کی مجلس برخاست ہوئی۔

دوسرے دن شنکر نے اپنا ترانہ شروع کیا۔ اس دن کا ترانہ جب کہ پہلا پہل محبت کی بانسری کے ترنم نے صحرائی ورانہ کی ہوائے خوابیدہ کو بیدار کر دیا تھا۔ بیچارے گوپی کے سمجھہ میں ہی نہیں آیا تھا کہ بجانے والا کون ہے۔ یا نغمہ کہاں سے آرہا ہے کبھی تو وہ جنوبی ہوا کے دل سے نکلتا معلوم ہوتا اور کبھی ان آوارہ مزاج بادلوں سے جو پہاڑ کی چوٹیوں سے آن ٹکرا رہے تھے۔ کبھی وہ پیغام ملاقات کے ساتھہ شرق سے رواں تھا اور کبھی غمناک آہوں کے ساتھہ مغرب سے بہتا ہوا آرہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ستارے اس بانسری کے روزن ہیں جس نے رات کے خوابوں کو سرود سے مملو کر دیا ہے موسیقی یکایک ہر طرف سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی کبھی جنگلوں سے آرہی تھی۔ کبھی مرغزاروں کی چمکدار سبزی سے نہ اسکے معنی ہی سمجھہ میں آرہے تھے اور نہ سننے والوں کو الفاظ ہی ملتے تھے کہ ان میں اپنی تمنا کا اظہار کریں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے مملو ہو گئیں تھیں اور ان کی زندگیاں موت کی منتظر تھیں جو زیست کو ختم کر دے۔

شنکر مجلس کو بھول گیا حریف کو بھول گیا اور اس مقابلہ کے امتحان کو بھول گیا وہ اپنے خیالات کی انجمن میں جو نسیم بہاری کی طرح اس کے گرد سرسرا رہے تھے۔ تنہا کھڑا ہوا تھا اور بانسری کا ترانہ الاپ رہا تھا۔ اسکے تصور میں وہ مورت گھوم رہی تھی جسکو ایک غیر محسوس سایہ اور ایک دور کے قدم کی ہلکی چھن نے مجسم کر دیا تھا اسکے سننے والے

ایک نا قابل بیان غمناک مسرت سے کانپ گئے جو بے پایاں اور غیر واضح تھی اور انہیں اسکی تحسین کرنی یاد نہ رہی۔

جب ان تاثیرات کا اثر کم ہوا پنڈت رک اٹھا اور للکار کر اپنے حریف سے کہا کہ اس عاشق اور معشوق کی اصلیت بتائے اسنے کہا عاشق کرشنا اور معشوق رادھا۔

پھر اسنے ان ناموں کی ماخذوں کی تحلیل و تشریح شروع کی اور ان کے ناموں کی مختلف تاویلیں کیں اسنے اپنے حیران حاضرین کے سامنے مختلف مذاہب فلاسفہ کے دقائق اور پیچیدگیوں کی کامل مہارت سے فرق بتایا۔ اسنے دونوں ناموں کے الگ الگ حروف لیے اور اپنے منطقی اوزار سے ان کے ساتھ ایسا بیرحمانہ برتاؤ کیا کہ آخر چل کر سوائے گرد و غبار ان میں اور کچھ باقی نہ رہا پھر اسنے ان الفاظ کو دوسرے ایسے معنوں میں ملبوس کیا۔ جو اس سے پہلے کسی چالاک سے چالاک لفظ ساز کے خواب و خیال میں بھی نہ گذرے تھے۔

پنڈت استعجاب اور مسرت سے بیخود ہو گئے کلمات تحسین بے اختیار انکی زباں سے نکلنے لگے بیچارے فریب خوردہ لوگوں نے انکا تتبع کیا۔ انہیں یقین کامل ہو گیا کہ آج حقیقت کے چہرے کا آخری نقاب ایک زبردست دل و دماغ نے الٹ دیا۔ پنڈرک کے اس جلیل القدر کارنامے نے انہیں اسقدر مسرور کر دیا کہ انہیں یہ پوچھنا یاد نہ رہا۔ آیا اس نقاب میں کوئی حقیقت تھی بھی یا نہیں۔ مہاراجہ دریائے حیرت میں غرق ہو گیا۔ موسیقی کا طلسم ٹوٹ گیا دنیا کی شبیہہ نے نرم اور ملایم مرغزار کی تازگی چھوڑ کر پتھروں کی پکی ہموار سڑک کا جمود اختیار کر لیا۔ لوگوں کی نظروں میں انکو اپنا شاعر اس عفریت کے مقابلہ میں ایک طفل مکتب معلوم ہو رہا تھا جو عالم الفاظ میں ہر شکل کو ٹھکراتا ہوا وسی آسانی سے روا لاتا تھا۔ ان کے سامنے پہلی مرتبہ اس راز کا انکشاف ہوا کہ شیکر کی تصنیف کردہ نظمیں بالکل سادہ اور محض خرافات تھیں نہ وہ دقیق تھیں اور نہ ان میں کوئی جدت تھی نہ وہ علم آموز تھیں (حیرت انگیز) اور نہ کارآمد صرف یہ ایک اتفاقی امر تھا کہ خود انہوں نے ویسی نظمیں

خستہ نوشتہ رادھا

نہ لکھیں۔

مہاراجہ نے اپنے شاعر کو نظروں سے پرچھانا شروع کیا گویا اسے آخری کوشش کرنیکی ترغیب دے رہا ہے لیکن شکر نے کچھ توجہ نہ کی اور اپنی جگہہ پر جما رہا۔ بادشاہ غصہ میں تخت سے اُترا۔ اپنے گلے سے موتیوں کا مالا نکالا اور پنڈرک کے سر پر رکھدیا۔ تمام حاضرین نے تالیاں بجائیں۔ بالاخانے کے برآمدے سے قباؤں کی سرسراہٹ اور کمرپٹوں کے سنہری گھنگروکی ہلکی ہلکی آوازیں آئیں۔ شکر اپنی جگہہ سے اٹھا اور دربارہ ہال سے رخصت ہوا۔

قمری مہینے کی آخری رات کی سیاہی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ ہمارے شاعر نے طاق سے تمام مسودے نکالے اور فرش پر ڈھیر کردئے۔ بعض مسودے بالکل ابتدائی زمانہ کے تھے جنہیں وہ بھول بسر گیا تہا۔ وہ اوراق الٹتا چلا گیا اور کہیں کہیں سے کچھ پڑھتا بھی رہا۔ اسے وہ سب لغو اور مہمل معلوم ہورہے تہے۔ گویا طفلانہ قوافی اور لفظی گورکھ دہندے کے سواان میں کچھ نہ تھا ایک ایک کرکے اس نے تمام رسالے پرزے پرزے کرڈالے اور دہکتی ہوئی انگھیٹی میں جھوک دئے۔ لے اے اگ یہ تیرے ہی لئے ہیں اس تمام ناکارہ زمانے میں تو ہی میرے دل میں شعلہ زن تہی اگر میری زندگی خالص کندن ہوتی تو کسوٹی پر کسی جاکر اور زیادہ روشن ہوئی لیکن نہیں وہ پامال گھانس کا میدان ہے جسکی نشانی سوائے مٹھی بھر راکھ کے اور کچھہ نہیں۔

رات بھیگنے لگی شکر نے دریچہ کے کواڑ کھولدئے اپنے بچھونے پر اپنے من موہن پھول گلاب نرگس اور چنبیلی بکھیر دئے گھر کے سارے چراغ لاکر کمرے میں روشن کردئے۔ شہد میں کسی زہریلی جڑ کا رس ملاکر کھالیا اور بچھونے پر دراز ہوگیا۔

دروازے کے باہر پازیب کی چھم چھم سنائی دی اور خوشبو سے لدی ہوئی ہوا کمرے میں داخل ہوئی شاعر نے انکھیں بند کئے ہوئے کہا "میری خاتون کیا آپ نے آخر کار اپنے خادم پر رحم کھایا اور اوسے دیکھنے آئیں۔ ایک شیریں اواز میں جواب ملا "میرے شاعر ہاں میں آئی ہوں" شکر نے آنکھیں کھولدیں اور اسے اپنے بچھونے کے برابر ایک عورت کی شکل نظر آئی شاعر کی

آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ اسے معلوم ہوا کہ وہی سایہ والی عورت جو اسکے دل کے مستور اور مقدس مندر میں حکمران تھی بیرونی دنیا میں آگئی ہے۔ تاکہ آخری وقت میں اسے ایک نظر دیکھہ لے۔

عورت نے کہا "میں کنواری اجتا ہوں"۔

شاعر بڑی کوشش سے اٹھ بیٹھا۔

شاہزادی نے آہستہ سے اسکے کان میں کہا۔ بادشاہ نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ تیرے شاعر کے مقابلہ میں تم نے فتح پائی میں اس لئے آئی ہوں کہ تم کو تاج ظفر سے سرفراز کروں۔

اس نے اپنے گلے سے پھولوں کا ہار نکالکر شاعر کے بالوں پر ڈالدیا۔ اور اجل رسیدہ شاعر بچھونے پر گر پڑا۔ فقط

ابوالفتح نصراللہ۔

غزل

تصور میں ہیں وہ پیارے کرشمے
یہہ تنہائی کے ہیں سارے کرشمے

خیال دلستانِ روئے جانان
یہہ ہیں سب تیرے نظارے کرشمے

قد و قامت قیامت چشم جادو
دہن اعجاز رخسارے کرشمے

کتان کی طرح دامن صبر کا چاک
عجب ہیں تیرے مہ پارے کرشمے

زمیں پر شعبدے ہیں دن کو ذرے
فلک پر رات کو تارے کرشمے

مہ و خورشید گوناگوں شب و روز
دکھاتے ہیں یہہ سیارے کرشمے

بشیر احمد حقایق ہیں نظر میں
اسی خالق کے ہیں سارے کرشمے

بشیر احمد

انجام حیات

(موت کا روشن پہلو)

ازمنۂ وسطیٰ میں آئرلینڈ کی نسبت بہت سے عجیب وغریب افسانے مشہور تھے۔ ان تمام قصوں میں زندگی اور موت کے جزیروں کا افسانہ نہایت ہی دلچسپ اور دلفریب ہے کہتے ہیں کہ منسٹر یعنی جنوبی آئرلینڈ کے کسی جھیل میں دو جزیرے تھے۔ ایک میں موت کا گذر ہی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن امراض اور دیگر مصائب کی اتنی افراط تھی کہ اس سرزمین میں اطمینان اور آسایش عنقا تھی شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا تھا جبکہ وہاں کے باشندوں کو کسی نہ کسی دکھ یا ناگہانی آفت سے دوچار ہونا نہ پڑتا ہو۔ ہر ایک متنفس کسی نہ کسی بلا میں گرفتار تھا۔ کوئی بیمار تھا تو کوئی زندگی سے بیزار۔ کسی کی بصارت زائل ہو چکی تھی تو کسی نہ کسی کو سماعت کا رونا تھا۔ غرض جدہر دیکھو ایک ماتم بپا تھا۔ آخرکار وہاں کے بسنے والے اپنی لاموت لیکن پُرالام زندگی سے اُکتا گئے اور امن و آسایش کی جستجو میں مقابل کے جزیرے کی جانب متوجہ ہوئے۔ انہیں خیال پیدا ہوا کہ شاید اس جزیرے میں چین و آرام نصیب ہوگا۔ اسلئے اُسی کو قیام گاہ بنائیں اور وہیں چلکر پناہ گزیں ہوں آئے دن کے نت نئے تکالیف نے اُنکے ارادے کو پختہ کر دیا اور ایک دن وہ مستعد ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور۔ ع ۔ ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم ۔ کہکر ناؤ پر سوار ہو اُدہر کا رخ کر دیا یعنی اور استقلال نے انکا بیڑا پار لگا دیا۔ جب ساحل سے گذر کر جزیرے میں پہونچ چکے تو انہیں معلوم ہوا کہ انکا خیال صحیح تھا۔ یہاں کوئی آفت تھی نہ بلا۔ اس جزیرے کا نام "موت" تھا۔

بادی النظر میں یہہ ایک معمولی افسانہ ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہہ فلسفۂ موت کی

پوری تصویر ہے۔ عموماً لوگوں کی نظر موت کے تاریک پہلو پر پڑتی ہے لیکن یہ افسانہ اسکے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی روح کے انجام کے متعلق فلسفیوں کے خیالات اور عقائد میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے لیکن ایک وقت اکثروں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ انسان کو کامل آزادی حقیقی مسرت اور دوامی امن موت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک موت سے خائف ہونا اور اُسے ایک آفت سمجھنا کوتاہ نظری کی دلیل تھی۔ تمام مصائب جن سے انسان کو اپنی زندگی میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسکی زندگی کو تلخ اور بے لطف بنا دیتے ہیں۔ خواہ وہ کسی شکل میں ہوں افکار و آلام کا ایک پر طلاطم دریا ان کے ساتھ رہتا ہے جس میں گھر کر نکلنا انسان کیلئے بہت مشکل ہے۔ لیکن موت ہی صرف ایک ایسی مصیبت ہے اگر ظاہر میں انسان اُسے مصائب میں شمار کرے جس سے زندگی کے لطف میں کوئی خلل نہیں پڑتا یا بالفاظ دیگر موت اُس وقت آتی ہے جبکہ حیات کا وجود ہی نہیں رہتا۔

موت کو زندگی کا انجام سمجھنا ایک فاش غلطی ہے۔ درحقیقت موت آغاز ہے۔ ایک زندگی کا۔ مرنیکے بعد انسان پھر وہی کیفیت اور وہی حالت اختیار کر لیتا ہے جو اُسکے عالم وجود میں آنے سے پہلے تھی جس طرح شمع گل ہونیکے بعد اپنی پہلی شکل اختیار کر لیتی ہے اسی طرح مردہ انسان اپنی اصلی حالت پر عود کرتا ہے۔ موت کے آتے ہی سارے رنج و الم کافور ہو جاتے ہیں اگر اسکی آمد کو ابدی شادمانی اور مسرت کی نوید نہ بھی سمجھیں تو اُسے غم کا مٹانیوالا اور ہر ایک تفکر کے دور کرنیوالا کہنا بالکل درست ہے موت ہی ہے جو غلاموں کو ظالم آقا کے پنجہ ستم سے رہائی دلاتی ہے جو مجرموں کے گلوں سے لعنت کا طوق اتارتی اور بیڑیاں کاٹ کر انہیں آزاد کرتی ہے۔ موت ہی مریض سے دکھ اور اذیت کا احساس دور کر کے اُسے کرب و بلا سے بچاتی اور مفلس کو افلاس کے شکنجے سے نجات دلاتی ہے۔ موت خدا کی آخری مگر اعلیٰ ترین نعمت ہے جو انسان کو مرحمت ہوتی ہے۔ اسی کے طفیل سے انسان کو تمام بکھیڑوں سے نجات ملتی اور سچی آزادی میسر آتی ہے۔ اگر عوام کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو موت اختتام ہے ایک ایسی بزم عشرت کا جس میں ہر شخص اپنے حوصلہ کی مناسبت سے

حظ اور سرور حاصل کرتا ہے۔ خواہ موت کی خواہش کریں یا اوس سے پرہیز اسکا ایک ایک دن آنا لازمی ہے۔ فطرت متقاضی ہے کہ تمام عناصر اپنے کرشمے دکھاکر پھر اپنی اصل شکل اختیار کرلیں فطرت کے قانون کے آگے سر تسلیم خم کرنا سب کا فرض ہے۔

غلام حیدر

عرب اور علم ہیئت
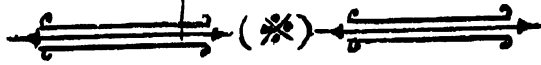
اسوقت جبکہ یونانی فلسفہ ہیئت بطلیموس کے بعد فنا ہو جانے کو تھا۔ یہ عرب ہی تھے۔ جنہوں نے اسکو اپنے ہاتھوں میں لیکر اپنے علم مثلث کی لاو سے اس علم میں حیرت انگیز اضافے کئے۔ مسلمان سلاطین شروع ہی سے تمام علوم کی سرپرستی کرتے رہے ہیں۔ ملک میں حکما کی قدر بادشاہوں کی سی ہوتی تہی ابن النیلوی لکھتا ہے کہ ۱۰۴۰ء میں قاہرہ کا کتب خانہ صرف ریاضی اور سائینس کی چھ ہزار کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ اندلس کے عربوں کی بہت سی تصانیف جلکر تلف ہوگئیں جو بچیں ان میں سے بہت ساری کتابوں کے ترجمے نہیں ہوئے اور غالباً یہ ترجمہ ممکن بھی نہیں کیونکہ ان حکیموں کی اصطلاحات سے زمانہ حال کے لوگ بالکل ناواقف ہیں ہمیں جو کچھہ مواد عربوں کے علم ہیئت کے متعلق ملتا ہے وہ ان ہی چند لاطینی اور دوسری زبان کے ترجموں اور نقلوں سے ملتا ہے جو غیر ممالک کے مصنفوں نے کئے ہیں۔ یہ معلومات ہمیں ایک اور طریقے سے بھی ملتے ہیں پیرس کے دولتی کتب خانے میں عربی استرلات موجود ہیں جو زبان حال سے اپنے موجدوں کی علمی ترقی کا پتہ دیتے ہیں۔

عرب کے ایک مشہور مصنف ابن العدمی کی تصنیف سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۵۹ھ م ۷۷۳ء میں خلیفہ المنصور کے دربار میں ہندوستان سے ایک ہیئت داں آیا تھا۔ یہ اپنے ساتھ ہندوستان کے علم ہیئت کے متعلق سدھانتا نامی ایک کتاب لے آیا تھا۔ خلیفہ کے حکم سے محمد بن ابراہیم الفضاری نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔

اگرچہ عرب کے علم ہیئت کی ابتدا ہندوستان ہی سے ہوئی تھی لیکن یونان نے اس علم میں زیادہ ترقی کی تھی۔ اس لئے خلفائے عباسیہ اب یونان کی طرف متوجہ ہوئے اور اون کی سرپرستی میں بطلیموس اور ارشمیدس (ARCHEMIDES) کی تصانیف کے عربی ترجمے ہونے لگے۔ جو سندہ سے ابرو تک (EBRO) تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئے۔ دمشق میں نویں صدی عیسوی کے شروع خلافہ بنی امیہ کی بنائی ہوئی ایک رسدگاہ تھی لیکن ۸۲۹ء میں جب بغداد کی رسدگاہ تیار ہوگئی تو اس کی شہرت جاتی رہی۔ ان رسدگاہوں میں جو مشاہدات کئے گئے تھے۔ انکا تذکرہ ایک کتاب ذیجات محققہ میں تھا لیکن یہ کتاب ہم تک پہونچ نہ سکی۔ دوسرے مصنفوں سے جو اسکا تذکرہ کرتے ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ ان رسدگاہوں میں کئی ایسے تجربے کئے گئے تھے جنکے انکشاف پھر دوبارہ انیسویں صدی میں بڑی سونچ بچار کے بعد کئے گئے۔ مثلاً سال مین دنوں کی تعداد انہوں نے نہایت صحت کے ساتھ دریافت کر لی تھی۔ اور دائرہ نصف النہار کے ناپنے مین بھی انہیں عملی کامیابی حاصل ہوگئی تھی۔

المامون کے زمانہ میں احمد بن محمد الفرعنی نے اصول ہیئت پر ایک کتاب لکھی جسکا ترجمہ لاطینی زبان میں ۱۴۹۳ء مین شائع ہوا جسکا آجتک یورپ مشکور ہے۔

۹۲۹ء میں محمد بن جابر البتانی عرب ہندسوں میں شہرہ آفاق تھا اس نے بھی اقلیدس کی طرح کئی مسایل جمع کئے۔ اگرچہ اسکی اصل دیکھین بہت جلد ذائع ہوگئیں۔ لیکن بارھویں صدی میں اسکا ایک ناقص لاطینی ترجمہ ہی یورپ میں اسکی شہرت کا ذمہ دار رہوا۔

اگرچہ اس زمانے میں نظام بطلیموس کو ساری دنیا مانتی تھی۔ مگر دسویں صدی ابتدا مین

بحوالہ: ڈریر۔ تاریخ ہیئت DREYEB: HISTORYE PLANETRYSYSXEM

ابن ماجور نے اسکے نظریہ کے خلاف ثابت کیا کہ چاند اور سورج کا درمیانی فاصلہ بڑہتا گھٹتا رہتا ہے اس نے کئی صحیح تقویمیں بہی تیار کین اسی زمانے مین کئی مشہور مقامات کے طول بلد اور عرض بلد مقرر کئے گئے۔

خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد ۳۴۶ھ ۹۴۶ء مین ایک ایرانی خاندان جس نے امیر الامرا کا خطاب حاصل کیا تھا سائینس اور علم ہیت کی سرپرستی کی طرف مائل ہوا۔ ۳۸۸ھ ۹۸۸ء مین شرف الدولہ نے اپنے باغ مین ایک رصدگاہ تعمیر کرائی اس رصدگاہ کے عملا ہلو ن مین محمد ابو الوفا ۹۵۹ء تا ۹۸۸ء بحیث مشہور رہا۔ اسکی ایک کتاب المحبسطی (ALMAGEST) سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے چاند کی حرکت کو بطلیموس کے بیان کے خلاف پایا۔ اس نے تحقیق کی تہی کہ علاوہ ان دو اختلافات کے جو چاند کی حرکت میں اسکے دائرے کے بیضادی ہونے اور آفتاب کی کشش کی وجہ واقع ہوتے ہیں ایک تیسرا اختلاف حرکت بہی ہے جو آفتاب کے فاصلہ کی وجہہ سے پیدا ہوتا ہے*۔

۱۰۳۰ء مین البیرونی محمود غزنوی کے مشیر نے کئی اور مشہور مقامات کے طول بلد اور عرض بلد معلوم کئے۔ جبل مقطم کی چوٹی پر جہان آج قلعہ بنا ہوا ہے کسی زمانے مین ایک مشہور رسدگاہ تہی۔ جہاں علی ابن ابی سید عبد الرحمان بن احمد بن جونس نے کئی تجربات کر کے بادشاہ الحکیم کے نام سے حکیمیہ زیچہ تیار کیا۔

۱۰۷۵ء مین ملک شاہ سلطان سلجوقی کے حکم سے بڑی کوشش کے بعد تقویم مروجہ میں اسی اصلاح کی گئی جو چھ سو برس بعد کی پوپ گیری گیری (GREGORY) کی اصلاح سے کئی درجے بہتر ہے۔

سلجوقیون اور مغلونکی فوج کشیان صلیبی جنگیں بغداد کی انحطاط کا باعث ہوئیں ملک میں امن وامان نہ تہا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد کے عوض اندلس اور قاہرہ کے دار العلوم علمی مرکز بنگئے۔ غیر قومون کے حملے اپنی سیاسی کمزوری خانہ جنگیاں یہ تمام باتیں اگرچہ عربون کو

---

* تمدن عرب۔ سید علی بلگرامی۔

زوال کی طرف لیجا رہے تھے لیکن علم کی آگ جو ہارون اور المامون نے بھڑکادی تھی
کسی طرح کم نہ ہونے پائی بلکہ بجھانے والے عناصر اور غیر اقوام میں بھی اپنا اثر پھیلا دیا۔

الفانسو دہم۔ (ALFONSO X) شاہ قسطلیلیہ (CASTILE) سنہ ۱۲۵۲ء
تا سنہ ۱۲۸۴ء) نے اسپارے میں خلیفوں کی تقلید کی۔ **الفنیۃ ذائچہ** تیار کرنے کے لئے
مختلف مقامات سے مشہور مہندس بلائے یہ ذائچہ الفانسو کے تخت نشینی کے
سال (سنہ ۱۲۵۲ء) مکمل ہوئے اور اون کی شہرت تمام یورپ میں تین سو سال تک رہی
یہ سنہ ۱۴۸۳ء میں پہلی بار شائع ہوئے لیکن اسکے پہلے ہی قلمی کاپیان چوطرف پھیل چکی تھیں۔
سنہ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان کے حملوں سے بغداد کی خلافت جاتی رہی۔ لیکن اسکے نئے وزیر
نصیر الدین طوسی[1] کی رائے سے اس نے فارس کے شمال و مغرب میں **مراغہ** کی مشہور رسدگاہ
تیار کرائی۔ **نصیر الدین** اور اسکے ساتھیوں نے بارہ سال کی جان فشان محنت کے بعد
القانی زیجین۔ تیار کیں **مراغہ** کی رسدگاہ زیادہ زمانے تک رہنے نہ پائی۔ اور ڈیڑھ
صدی تک پھر علم ہیئت کی ترقی کے کچھ آثار نہ تھے۔

تیمور کے پوتے **الغ بیگ** نے سنہ ۱۴۲۰ء میں **سمرقند** میں ایک اور رسدخانہ تیار
کرایا جہاں دنیا کے مشہور ہیئت دان جمع کئے گئے۔ سنہ ۱۴۳۷ء میں اس نے ایک کتاب شائع کی
جس مین پندرہوین صدی کے نصف تک عربوں کے علم ہیئت کی ترقی کے اسباب وواقعات
تفصیل سے درج ہیں اسمین تقویم اور ہیئت کے عام اصول اور نظریہ بتائے گئے ہیں۔
عملی ہیئت کسوف وخسوف کے حسابات وو جوہات جدولونکی تیاری اور استعمال کی
ترکیبین بتائی گئی ہیں اسمیں وہ جدولیں بھی ہیں جن میں ستاروں کی فہرست شمس و قمر اور
دوسرے سیاروں کی حرکتیں بہ تفصیل درج ہیں یہ جدول یونانی حکیم **ایپرکس**۔
(HIPPAROHUS) کے زمانے کے بعد اپنی طرح کی پہلی جدول ہے[2]
الغ بیگ نے علم ہیئت اور نجوم میں اس درجہ ترقی کی تہی کہ اخرہی علم اسکی موت کا باعث ہوا۔

[1] یہ حکیم خراسان مین سنہ ۱۲۰۱ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۲۷۴ء میں وفات پائی۔
[2] جارج فوربس (GEORGEFORBES) ہسٹری آف اسٹرانومی (HISTORYOFASTRONOME)

کہتے ہیں کہ اس نے اپنے علم نجوم سے معلوم کیا کہ اسکی موت اپنے بیٹے کے ہاتھ واقع ہوگی پیش بندی
کیلئے اسنے اپنے بیٹے کو شہر بدر کر دیا جسکا نیتجہ وہی ہوا جس سے یہہ ڈرتا تہا اسکے بیٹے نے
علم بغاوت بلند کیا اور ۲۴۹ھ سنہ ۸۶۳ء میں دار الخلافہ پر آ دھمکا اور اپنے باپ کو قتل کر ڈالا۔
مشرقی علم ہئیت کا یہہ آخری سرپرست تہا جسکے بعد اس علم کا ستارہ مشرق سے ایسا ڈوبا
کہ نام و نشان تک نہ رہا فقط

میر محمد علی خان

تاریخ برق

مشرق میں طالیس (THALES) نے یہہ دریافت کیا کہ کہربا کو کسی اور شئے سے
رگڑنے پر اس میں کشش کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے کاغذ کے چھوٹے پرزے وغیرہ اسکی طرف
کھنچے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانہ میں سیریا کی عورتیں پتوں وغیرہ کو جو کپڑوں کو
لگ جایا کرتے تہے اس کہربا کی مدد سے علحدہ کیا کرتی تہیں۔
سنہ ۶۲ء میں ایک بڑا مصنف پلینی (PLINY) پیدا ہوا جس نے بعد ازاں کہربا
اور اوسکی خاصیتوں کے متعلق کئی کتابیں لکہیں اسکا خیال تہا کہ کہربائی قوت اور مقناطیسی
قوت ایک ہیں اس نے یہہ بہی دیکہا تہا کہ برقی مچہلی میں یہ بات ہے کہ اسکو چھونے سے جھٹکہ
محسوس ہوتا ہے لیکن پلینی کی عقل یہاں تک رسائی نہ کر سکی کہ مقناطیس کہربا اور برقی
مچہلی کی قوتوں میں کوئی تعلق بتا سکے اس خاصیت کے متعلق ایوسٹاتھیس (EUSIATHIUS)
نے سنہ ۱۱۵۲ء میں بڑے دلچسپ واقعات قلمبند کئے ہیں وہ لکہتا ہے کہ گاتہس کے بادشاہ والیمر

WOLIMER کے جسم سے شرارے نکلا کرتے ہے اسی طرح ایک حکیم کے بدن سے تبدیل لباس کے وقت چنگارتی آواز کے ساتھ اسی قسم کے شرارے صادر ہوتے تھے اور اکثر آواز کیساتھ روشنی بھی نمودار ہوا کرتی تھی ۔

اسکے بعد گیارہ صدیاں گزر گئیں اور کسی نے اس طرف التفات نہ کیا ان کے خواب خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ چند انکشافات جو تھلیس اور پلینی نے کئے ہیں ایک روز دنیا کی کایا پلٹنے والے ہیں۔ ڈاکٹر ولیم گلبرٹ (WM: GILBERT) (سنہ ۱۵۴۰ء تا ۱۶۰۳ء) نے دنیا کی توجہ پھر اس طرف منعطف کرالی اور اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو انکشاف برق کا سہرہ گلبرٹ ہی کے سر ہے کیونکہ سوتی دنیا کو اسی نے جگایا یہ شخص کوئن الزبتھ کا ڈاکٹر تھا۔ اسنے تجربات کئے کہ کہربا کے علاوہ کئی اور چیزوں مثلاً گندک کانچ ربر وغیرہ میں بھی یہ خاصیت ہے کہ رگڑنے کے بعد چھوٹے پرزوں اور روموئیں وغیرہ کو بھی کھینچ لیتے ہیں اسکے انکشاف کے بعد لوگوں کو اس نئی قوت کہربائی میں دلچسپی پیدا ہو گئی اور سال بسال نئے نئے انکشافات ہونے لگے ۔

طبیعات کا طالب علم رابرٹ بائل کے نام سے ناواقف نہیں رہ سکتا۔ اسنے انکشاف برق میں بہت بڑا حصہ لیا یہ شخص سنہ ۱۶۲۷ء میں پیدا ہوا۔ اسکا عجیب دماغ تھا دس برس میں جبر ومقابلہ کا ماہر ہو گیا ہوا خالی کرنیکا پمپ اسی نے ایجاد کیا۔ اس نے دریافت کیا کہ برقی قوت کسی شئے میں بہت دیر تک قایم رکھی جاسکتی ہے اور گلبرٹ کی برقی اشیا کی فہرست میں اسنے اضافے کئے اس نے ایسی شہرت حاصل کی تھی کہ سارا یورپ اس نئی ایجاد کردہ قوت کے متعلق تجربات کرنے لگا۔ صرف اسی لئے کہ رابرٹ بائیل جیسا شخص اسکی تحقیق کر رہا ہے۔

سنہ ۱۶۹۱ء میں بائیل کے انتقال کے بعد اسکا ایک ہمعصر اوٹو وان گیورک (OTTOVON QUERIOKE) نے اپنے تجربے کئے یہ شخص مگ ڈی برگ پرشیا (MAGDEBURG PRUSSIA) کا باشندہ تھا اسی نے پہلے پہل برقی روشنی معلوم کی اسکا تجربہ اسطرح پر تھا کہ اوس نے گندک کو کانچ کے گولہ میں ڈھالا اسکے بعد کانچ کو توڑ دیا اور اس

گندک کو اندھیرے میں رگڑنے پر روشنی پیدا ہوئی لیکن بدقسمتی سے اسکے زمانہ میں علم کی اسقدر
ترقی نہ ہوئی تھی کہ لوگ اسکے انکشاف کو سمجھہ سکیں۔ اسی نے یہ بھی بتلایا کہ برقائی ہوئی اشیار کو
غیر برقائی اشیار کے قریب لانے پر غیر برقائی اشیا میں بھی برقی قوت آجاتی ہے سر اسحاق
نیوٹن (ISAAC NEWTON) نے ایک اور تجربہ کیا کہ پیتل کی ایک بوتل پر جیسمی چند پرزے رکھے
ہوں اگر ایک برقایا ہوا کانچ کا ڈھکن رکھا جائے تو یہ پرزے بڑی زور سے اچھلنے لگتے ہیں۔
۱۷۰۵ء میں فرانسس ہاکسبی (HAWKSBEE) نے بھی برق کے متعلق تجربے کئے۔
یہ شخص رایل سوسائیٹی کا رکن تھا اور یہی پہلا سائنس داں ہے جسنے برقی شراروں اور بجلی میں مشابہت کیطرف
لوگوں کو رجوع کیا۔

اس زمانہ تک برقی کی صرف تحقیق ہی ہوتی تھی لیکن اب ہم اس زمانہ کے قریب آرہے ہیں
جب سے اس نئی قوت کی مدد سے انسان عملی فائدے اٹھانے لگا۔ سٹیفن گرے (GRAY) نے
اٹھارویں صدی کے شروع میں اسکی تحقیقات شروع کی اور تمام چیزوں کے دو گروہ کئے:۔
ایک وہ جنمیں رگڑ سے برقی قوت پیدا کیجا سکتی ہے اور دوسرا وہ جس میں یہ خاصیت نہیں ہے۔
اس نے تحقیق کی کہ ثانی الذکر گروہ کے اشیار کو برقائی ہوئی چیزوں کے قریب لانے سے انمیں بھی
برقی قوت آجاتی ہے۔ اس نے ایک تجربہ کیا جس میں کانچ کے ایک استوانہ میں برقی قوت پیدا کرکے
سادی ستلی کے ذریعہ (۸۸۶) فیٹ تک یہ برقی قوت بھیجی گئی۔

فرانس کے ایک اور سائنس دان ڈوفے (DUFAY) (۱۶۹۹ تا ۱۷۳۹) نے
گرے کے تجربوں کی تصدیق کی اور ذاتی تجربہ کیا کہ برقائی ہوئی ستلی کو پکڑے رہنے سے انسان بھی
برقایا جا سکتا ہے اور دوسرے شخص کے اسے ہاتھہ لگانے پر والیمر کی طرح اسکے جسم سے بھی
شرارے نکل سکتے ہیں۔ تجربوں سے جب اسنے معلوم کیا کہ برقائی ہوئی ریشم کی دو ستلیاں [illegible]
نہیں آسکتیں البتہ ریشم اور اول (دو برقائی ہوئی ستلیوں میں کشش پائی جاتی ہے۔ اس [illegible]
اس نے نتیجہ نکالا کہ برق دو قسم کی ہے:۔ (۱) مثبت (۲) منفی۔ ایک طرح کی برقائی ہوئی اشیا [illegible]

تدافع اور غیر طرح کی برقائی ہوئی اشیا میں کشش ہوا کرتی ہے۔ اس اصول کے قایم ہونے کے بعد مشین تیار ہونے لگے جن میں کانچ کے استوانوں کو ربڑ یا کسی اور شئے سے رگڑنے سے برقی قوت پیدا کیگئی اور مثبت و منفی برق کے قریب آنے سے جو شرارے نکلتے تھے اُن سے مسپرٹ موم وغیرہ کو آگ لگانے کا کام لیا گیا۔

اٹھارویں صدی کے وسط تک جو برقی قوت پیدا کیجاتی تھی وہ پیدا ہوتے ہی کھُلی ہوا میں زائل ہو جاتی تھی۔ اب لوگ اس برقی قوت کو جمع رکھنے کے خواہشمند ہوئے۔ کنیس (CUNAES) وان کلیسٹ (VONKLEIST) اور مسچنبروک (MUSSCENBROEK)۔ باشندۂ لیڈن (LYDEN) ہالینڈ۔ ان تینوں کو ایک ہی زمانہ میں ایک ہی بات سوجھی تھی۔ جسکا نتیجہ لیڈن مرتبان (LYDEN JAR) تہا آخرالذکر پروفیسر نے کچھہ پانی میں برقی قوت پہنچائی۔ پانی کے اس بوتل کو دہات کا ایک نل لگا ہوا تھا۔ اس کے بیچ میں لوہے کی ایک سیخ تہی اس سیخ میں سے بلحاظ ضرورت برقی قوت پہنچائی جا سکتی تہی۔ پروفیسر صاحب ایک ہاتھہ میں بوتل پکڑے ہوئے تہے کہ اتفاق سے ان کا دوسرا ہاتھہ سیخ پر پڑا اور اس روز کا جھٹکہ ہوا کہ انہوں نے قسم کھائی کہ اگر مجھے ہفت اقلیم کا تاج بہی دیا جائے تو وہ تجربہ پھر نہ کرونگا۔

اگرچہ لیڈن مرتبان کا انکشاف ہالینڈ میں ہوا تہا لیکن انگلستان کے پروفیسر ولیم واٹسن (WATSON) نے اسکی تکمیل کی۔ واٹسن ۱۷۱۵ء میں پیدا ہوا۔ یہ ایک غریب تاجر کا لڑکا تہا اس نے لیڈن مرتبان کے اندر ٹین (TIN) کا پتر لگا کر اسکی تکمیل کردی۔ اس نے برقی رو کو ۲ میل کے فاصلہ تک پھیلا کے ثابت کیا کہ ادہر لیڈن مرتبان سے برقی لیڈن رو چھوڑی گئی۔ اور تقریباً اسی وقت تار کے دوسرے سرے پر جھٹکہ محسوس ہوا۔ رفتار برقی کی اس تیزی کی انکشاف کے طفیل آج بے تار برقی دنیا میں رائج ہے۔ واٹسن نے برق کی مدد سے بارود کو آگ لگائی اور برق کی کئی محیرالعقل قوتیں بتلائی جن سے زمانہ واقف نہ تھا۔

اسی زمانہ میں امریکہ کا ایک بڑا شخص اس کے متعلق تجربے کر رہا تہا۔ جن میں فرانکلن

بنجامن فرانکلن (BENJAMIN FRANKLIN) سنہ ۱۷۰۶ء میں شہر باسٹن (BOSTON) میں پیدا ہوا۔ اسکا خاندان غریب تھا اسلیئے یہ تعلیم سے کچھ زیادہ بہرہ اندوز نہ ہو سکا۔ نیو یارک فلاڈلفیا اور لندن کے چھاپے خانوں میں شاگردی کرکے آخر فلاڈلفیا میں اپنا خاصہ مطبع قایم کیا آگے چلکر امریکہ کا ایک بڑا سیاسی لیڈر رہا اور آج تک امریکہ کا ہر آزاد شخص اسکے نام کی عزت کرتا ہے۔ سیاسی بکھیڑوں کے ساتھ ساتھ اس نے سائینس کے ایسے ایسے اہم تجربات کئے ہیں جس سے ساری دنیا اس کی مشکور رہے۔ اسے یقین تھا کہ بجلی اور برق جسکو انسان تیار کرتا ہے ایک ہی ہے۔ اسکے ثبوت کیلئے اس نے ریشم کی ایک تینگ بنائی اسے ایک سُتلی کے ذریعہ اڑایا ہاتھ کے پاس سُتلی کو ریشمی فیتہ باندہا۔ اور سُتلی اور ریشمی فیتہ کے ملاپ کی جگہہ ایک کنجی لٹکائی۔ ایک دن جب طوفانی ابر آیا ہوا تھا اسنے اپنی تینگ ابر تک اڑائی اس نے ایک مضمون شایع کیا تہا کہ ابر میں یقیناً برق ہے۔ اب وقت آگیا تہا کہ یا اسکی شہرت صفحہ ہستی پر ہمیشہ کیلئے قایم ہوجائے۔ یا ساری دنیا اس پر ہنسنے لگے اپنے لڑکے کے ساتھہ دروازہ مین انتظار کرتا کھڑا ہوا تہا۔ پہلا ابر گذر گیا۔ کچھہ نتیجہ نہ نکلا۔ فرانکلن کو ہیبت ہونے لگی۔ تینگ پر دوسرا ابر آیا اور اسنے دیکھا کہ سُتلی کے تار علحدہ کھڑے ہونگے اسنے اپنی انگلی انکے قریب لائی اور تار اسطرف جھک گئے کنجی پر اسنے ہاتھہ رکہا اور فوراً جھٹکہ محسوس ہوا کنجی کے پاس لیڈنی مرتبان لایا اور تھوڑی دیر میں برقی قوت اسمیں بہرگیی اور برقی شرارے بہی نظر آئے ایسے اسکی فتح کامل تھی مثبت (POSITIVE) اور بعضوں میں منفی (NEGATIVE) اس نے یہ معلوم کرکے اس علم کو انسانی فائدہ کی طرف لگایا اور برقی موصل (LIGHTNING CONDUCTOR) ایجاد کی جس سے تینگ کی طرح ابر کی ساری قوت زمین میں پہنچا دی جاتی ہے۔ سنہ ۱۷۹۰ء میں اس نے انتقال کیا۔

اب تو ایجادات کا سلسلہ پڑ گیا سنہ ۱۷۵۱ء میں جان کنٹن (JOHN CANTON) نے کئی برقی آلے ایجاد کئے منجملہ جنکے بڑے بڑے مصنوعی برقی مقناطیس تھے اسنے تحقیق کی کہ دوسری

اشیا کی طرح ہوا کو بھی برتا یا جاسکتا تہا۔

لیکن ہنری کیاونڈسن (CAVENDSN) نے جو تحقیقات برق کی مدد سے کئے۔ اسکے کسی متقدم نے نہیں کئے یہ شخص ڈیوک آف ڈِنشائر ثانی کا (DNKEOEDEVDNSNIREH) پوترا تہا بمقام نائیس (NICE) ۱۷۳۱ء میں پیدا ہوا۔ روپیہ تہا پیسہ تہا کمی کا ہے کی سائینس سے شوق تہا لگے ہاتہہ تجربات کرنے لگے۔ اس نے برقی شراروں کی مدد سے آکسیجن (OXYGEN) اور ہائیڈروجن (HYDROGEN) کے مخلوط کو بھڑکایا جس سے پانی بنا اور ظاہر ہو گیا کہ پانی ان دو گیسوں کا کیمیائی مرکب ہے کیاونڈسن نے ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔

اسی کے زمانہ میں بولوگنا (BOLOGNA) اطالیہ کا باشندہ لوگی گلوانی (LUIGI GALYANI) اور السانڈرو والٹا (ALESSANDRO YOLTA) باشندہ کومو (COMO) کچہہ اور ہی تجربات کر رہے تہے۔ والٹا ہی پہلا شخص تہا جس نے برقی قوت پیدا کرنیکی کیمیائی ترکیب بتلائی اس کا انکشاف اس طرح ہوکہ برقی مشین سے کام کرتے ہوئے گلوانی نے دیکہا کہ تازہ مری ہوئی مینڈک کے پیر برقی رو سے ہلنے لگتے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا ابر کی برق میں بہی یہ خاصیت ہے یہ تانبے کے سیخ سے مینڈک کو پکڑا ہوا چاندنی کی لوہے کی پٹری کو لگا رہا تہا۔ جونہی لوہا اور تانبا ملے کہ مینڈک کے پاؤں پھر اسی طرح کہنچ گئے۔ لہٰذا اسے خیال کیا کہ مینڈک کی رگوں میں وہ برقی قوت باقی تہی۔ والٹا نے اسکے نظریہ کی مخالفت کی اور کہا کہ برقی قوت دو دھاتوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی اسنے میز پر تانبے کا ایک پتر رکہا اس پر ہلکا ئے ہوئے سلفیورک ترشہ (DIL:SULPHURICACID) مین بہگو کر ایک کپڑا رکہا اس پر جست کا پتر بچھایا پھر اسپر بھگویا ہوا کپڑا رکہکر تانبے کا پتر بچھایا غرض ایسی ایک ڈھیر بنائی اور جست اور تانبے کو تار کے ذریعہ ملایا۔ اب جو تار کو علٰحدہ کرنے لگا تو برقی شرارہ نظر آیا اور برقی قوت کے تیار کرنے کا ایک آلہ ایجاد ہو گیا۔ آگے چلکر اس ایجاد کی ترقی کی گئی اور ڈھیر کے عوض وولٹوی خانہ (YOLTAIC CELL) بنایا گیا جسمیں ہلکایا ہوا۔

سلفیورک تیزشہ ڈالاجاتا ہے اور جست اور تانبے کے دو پتر اس میں ڈبوئے جاتے ہیں۔ ان پتروں کو اوپر سے ملانے پر برقی رو پیدا ہوئی۔ اب اس وولٹوئی خانہ سے سہولت یہ ہوگئی کہ جب چاہے برقی رو پیدا کی گئی اور دور (CIRCUIT) کے توڑنے سے جب چاہے رو توڑ دی گئی۔ لوگوں نے یہہ بھی معلوم کیا تہا کہ برقی رو سے تار گرم ہوجایا کرتا ہے اس اصول کی مدد سے ہمفری ڈیوی (HUMPHERY DAVY) نے برقی روشنی ایجاد کی۔

لوگ دیکھتے آرہے تہے کہ برقائی ہوئی اشیاء میں بھی قوت کشش ہے اور مقناطیس میں بھی۔ لہذا اب کھوج پڑی کہ ان دونوں میں کچھہ نہ کچھہ تعلق ہونا چاہئے۔ پروفیسر اورسٹڈ OERSTED نے ۱۸۲۰ء میں اس تعلق کی تحقیق کی۔ اسنے دیکھا کہ جس تار میں سے برقی رو جارہی ہو اگر اوس کے اوپر مقناطیسی سوئی لٹکائی جائے تو اسکا قطب شمالی مغرب کی طرف پلٹ جاتا ہے اور اگر نیچے رکھی جائے تو مشرق کی طرف۔

اب ہم ایک غریب لوہار کے لڑکے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جسنے شاندار تحقیقات کی ہیں میکل فیرڈے (MICHAEL FARADAY) ۱۷۹۱ء میں شہر لندن میں پیدا ہوا تہا۔ اسکا باپ نہایت غریب آدمی تہا۔ وہ ایک جلدساز کا شاگرد بنگیا سارا دن کام کرتا شام میں کچھہ پڑھ لیا کرتا ایک دن ایک شخص نے اسکی دکان سے گذرتے ہوئے دیکھا ایک قاموس العلوم (Encyclopaedia) کی جلدبندی کرتے کرتے یہہ لڑکا برقیات کے مضمون کو بڑے غور سے پڑھ رہا ہے۔ اس قدر ادق مضمون کو ایک جلدساز کے لڑکے کو پڑھتے دیکھکر اسے تعجب ہوا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ دن کے کام کے بعد شام میں خود تجربات کیا کرتا تھا۔ روپیہ اسکے یہاں نہ تہا۔ اپنے ہاتھہ سے ایک بیاٹری بنالی تہی۔ اس شخص کو رحم آیا اور اوس نے سر ہمفری ڈیوی کے لکچروں* کیلئے چار ٹکٹ خرید کردئے۔ فریڈے خوش خوش تہا لکچروں کو گیا اور سخت محنت سے انہیں نوٹ کرنے لگا۔ اختتام لکچر پر ڈرتے ڈرتے پروفیسر کے

---

* یہ لکچر اسوقت رایل انسٹیٹیوشن میں دئے جارہے تہے۔

قریب جاکر اپنے نوٹ دکھلائے اور اپنے سائنس داں بننے کی خواہش ظاہر کی ڈیوی نے اسکے
استقلال کا امتحان کر کے اسکو اپنا نائب مقرر کر لیا۔ براعظم یوروپ کے سفر میں اسکو اپنے ساتھہ
رکہا اور فریڈے کو اتنی مہارت حاصل ہو گئی۔ کہ ڈیوی کے انتقال کے بعد یہ اوسکا جانشین بنگیا۔
اوڑسٹڈ نے معلوم کیا تہا کہ برقی قوت سے مقناطیسی سوئی پلٹ جاتی ہے تو فریڈے نے تحقیق کی
کہ مقناطیس کے ذریعہ برقی رو پیدا کیجا سکتی ہے۔ اس نے دیکہا کہ مقناطیس کے نزدیک لپیٹی
ہوئی تار آنے سے خطوط قوت LINES OF FORCE پیدا ہوتے ہیں لہذا اگر یہ تار ان خطوط
میں سے کئی مرتبہ گذرے تو اس میں اتنی ہی زیادہ برقی قوت پیدا ہوگی اس اصول سے ٹیلیفون
میں یا آبشار سے برقی قوت استعمال کیجاتی ہے۔ آبشار سے برقی قوت لینے کی ترکیب خالی از
دلچسپی نہ ہوگی۔

دریا

نہریں

نلے جنمیں سے پانی کارخانہ کو جاتا ہے

پانی کا نکاس

تار

نوٹ۔ توضیح کے لحاظ سے تناسب کا
خیال نہیں رکہا گیا اور پہیہ مقناطیس وغیرہ
بہت بڑے بنائے گئے ہیں سیوا اسمندر
(علاقہ میسور) کے آبشار کی اونچائی ۸۰ فیٹ ہے۔

مقناطیس جنکے اطراف برقی تار لپیٹے ہوئے ہیں

آبشار کے سرے سے نہریں لیجاتی ہیں جو آخرش لوہے کے مضبوط نلوں میں گرتی ہے یہ نلے کارخانہ برق میں
پہنچائے جاتے ہیں اور پانی ایک پہیہ پر گر کر اسکو اس تیزی سے گہماتا ہے کہ آر پار کی اشیا صاف
نظر آنے لگتی ہیں اس پہیہ کے ساتھہ دو بڑے مقناطیس لگے ہوئے ہیں جنکی اونچائی تقریباً دس فیٹ
ہوتی ہے ان پر برقی رو کا تار لپیٹا جاتا ہے جس سے انکی قوت بہت زیادہ ہو جاتی ہے پہیہ کے
گہومنے سے یہ بہی گہومنے لگتے ہیں۔ ایک تار اسکے اطراف لپٹا رہتا ہے مقناطیس کے گہماو سے
گویا تار ہر بار نئے نئے خطوط قوت سے ملتا ہے اور اس طرح اس میں فریڈے کے اصول کے
مطابق برقی قوت پیدا ہوتی ہے یہ قوت قابلوں میں (RECEIVERS) میں بہیجی جاتی ہے

جہاں سے ہزار ہا میل تک بھیجی جاسکتی ہے*۔

اب پھر لوگ برق کی اصلیت پر سوچنے لگے۔ کلارک کسول (CLERKMAXWELL) ۱۸۳۱ء تا ۱۸۷۹ء نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ برقی رو سے فضا میں موجیں پیدا ہوتی ہیں جو ہر مادہ میں سے گذر سکتی ہیں۔ ہنرچ رڈالف (HEINRICHRUDOLF) ۱۸۵۷ء تا ۱۸۹۴ء معکول کے قانون کو تجربوں سے ثابت کیا۔ اسنے ان موجوں کی لانبائی اور رفتار کی پیمائش بھی کی لیکن شہرت تھی کسی اور کے سر اور آج کل دنیا کا مشہور سائنداں گلگیلمو مارکونی (GUGLIELEMO MARCOM) نے اس اصول کی مدد سے بے تار برقی کی بنا ڈالی جو آج دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔

سید محمد کرمانی

بے ثباتی زندگی

(※)

آہ کیا ہے زندگی پچھلی پہر کا خواب ہے
دل کا پیمانہ لبالب ہے امید و بیم سے
ساقی ہے مطرب ہے نغمہ ہے صدائے چنگ ہے
عیش کا ساماں ہے سب اور صحبت احباب ہے
پر تو اپنے دل کو ہر گز یاں نہ اے ارمان لگا
مخمل و دیباکے جسکو فرش پر آتی تھی نیند
الغرض فانی ہے یہ اسکو نہیں کچھ بھی ثبات

موت کا پیغام ہے درسِ فنا کا باب ہے
آرزو پیش نظر شام و سحر بیتاب ہے
میکش توبہ شکن ہے بزم شراب ناب ہے
نغمہ ہے تاروں میں پنہاں تشنۂ مضراب ہے
روح کا طائر قفس میں مضطر و بیتاب ہے
خاک پر کنج لحد میں آج محو خواب ہے
چاردن کا عیش ہے پھر سب خیال و خواب ہے

محمد عبدالرزاق ارمان

---

* علاوہ میسور میں برقی روشنی پنکھے وغیرہ وغیرہ تمام اسیطرح کی پیدا کردہ برقی قوت سے چلتے ہیں۔

فلسفہ اور عربوں کی کیاست

علم صرف و نحو

(۱)۔ دسویں صدی عیسوی کے مسلمان فاضلوں نے علوم (سائنسوں) کی تقسیم دو طرح پر کی ہے ایک علوم عربیہ، اور دوسری قدیمہ، یا علوم غیر عربیہ! قسم اول میں صرف و نحو اخلاق، عقاید، تاریخ ادب اور علم لغت کو شامل کیا ہے اور دوسری قسم فلسفہ، طبعیات اور طب پر مشتمل ہے ایک بڑی حد تک علوم کی یہہ تقسیم درست ہے۔ موخرالذکر علوم نہ صرف اجنبی اثرات سے بڑی حد تک متاثر ہوئے۔ بلکہ حقیقت میں عام پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے اس پر بھی جن علوم کو عرب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ بالکل عربوں ہی کی محنت کا نتیجہ نہیں تھے۔ کیونکہ ان علوم کا بھی جو نشو و نما یا فروغ اور ترقی ہوئی۔ وہ اسی جگہہ ہوئی جہاں اسلامی سلطنت میں عرب اور غیر اقوام کا میل جول رہا اور جہاں اسی بات کا احساس پیدا ہوا۔ کہ وہ ان مضامین پر غور کریں۔ جو عام بنی نوع انسان سے گہرا تعلق رکھتے ہوں۔ جیسا زبان۔ شاعری۔ قانون۔ مذہب۔ اور سوچیں کہ ان میں کیا کیا اختلافات اور نقائص ہیں؟

جس حالت میں یہہ امر مشکل پذیر ہوا ہے۔ ایسی اس بات کا سراغ لگانا۔ آسان ہے کہ غیر عرب اور خاص کر ایرانیوں کا کہاں تک اس پر اثر پڑا۔ اور اس کی ترقی اور تدریج میں یونانی فلسفہ نے جو کام کیا اوسکی اہمیت زیادہ تر نمایاں ہوتی ہے۔

(۲) زبان عربی (جس میں خود عربوں نے بسبب اسکی وسعت اس کی ساخت اسکے الفاظ کی بھتات۔ اور اس کی جبلی نشو و نما کی قابلیت کے خاص دل چسپی لی) خود اس قابل تہی کہ وہ دنیا میں

ممتاز جگہہ حاصل کرے۔ مثال کی طور پر اگر اس کا مقابلہ درشت لاطینی یا مبالغہ امیز فارسی سے بہی کیا جائے تو وہ (عربی) بوجہ اپنے مختصر معنی خیز فقرون کے (اور یہہ وہ چیز ہے جو علمی باتون کے ظاہر کرنے میں بڑا حصہ لیتی ہے)۔ ان سے ہیں بیں رہیگی۔ زبان عربی اس قابل ہے کہ نازک سے نازک خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا سکے۔ مگر چونکہ اسی کا ذخیرہ مترادف الفاظ سے مالا مال ہے اسلئے ارسطا طالیس کے قانون (کہ مترادفات کا استعمال خالص سائنس میں جائز نہین۔) سے منحرف ہونے کی ترغیب دلاتا ہے۔

ایسی نفیس۔ پر مغز اور ساتھ ہی مشکل زبان جیسے عربی تہی۔ جب وہ سیریا (شام) اور فارس کی ہو نگی شایستہ زبان بنگئی۔ تو بجا طور پر لوگوں کو اس کی گہری تحقیق کی ضرورت پڑی۔ جو ئی کی بات یہہ ہے۔ کہ قرآن پاک کا مطالعہ اس کی قرأت اور اوس کی تفسیر عربی زبان کے متعلق ایک خاص اور عمیق دہیان کی طلبگار ہوئی ممکن تہا کہ منکرین اسلام یہہ خیال کریں کہ وہ قرآن پاک کی نحوی غلطیوں کی گرفت کر سکین گے۔ بدیں وجہ قدیم نظمیں اور اس وقت کے بدویوں کی روزمرہ اکہٹی کی گئی۔ تاکہ قرآن پاک کی فصاحت وبلاغت کی تائید میں مثالوں کے طور پر پیش کی جائیں۔ اور اس مین شک نہیں کہ مثالوں کے ساتہہ عام طور پر صحت صرف ونحو کے متعلق بہت سی باتیں زیادہ کی گئیں۔ بہ حیثیت مجموعی اس زمانہ کے محاورات کا استعمال معیار بنگیا تاہم قرآن کی سند کو محفوظ رکہنے کے لئے یقیناً اس معیار کا استعمال دانشمندی سے کیا گیا

اس عمل کو ڈہلمل یقین والون نے ہمیشہ شبہہ کی نظروں سے دیکہا چنانچہ مسعودی (متوفی ۹۵۶ء) بصرہ کے چند نحویوں کی نسبت کہتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ کہیں تفریح کیلئے جا رہے تہے کہ اثنا ر راہ میں قرآن کے اک صیغہ امر کے متعلق بحث کرنی شروع کی۔ نتیجہ یہہ ہوا کہ گاؤں کے لوگوں نے (جو اسوقت کہجوریں جمع کر رہے تہے) انکی لاٹھی سے خوب خبر لی۔

(۳) عرب اور بہت ساری چیزون کی طرح علم نحو کو حضرت علیؓ سے منسوب کرتے ہیں اور یہہ بہی کہا جاتا ہے کہ ارسطا طالیس کی طرح انہون نے کلمہ کی سہ گونہ تقسیم کی۔ مگر حقیقت

یہہ ہے کہ کوفہ اور بصرہ۔ اس علم کے نشو ونما کا گہوارہ ہے۔ اسکی ابتدائی ترقی تاریکی میں گہری ہوئی ہے۔ کیونکہ سیبویہ (متوفی ۷۹۳ء) کی کتاب میں نحو کو ہم ایک مکمل اور مہذب صورت میں دیکھتے ہیں۔ یہہ ایک بڑا بہاری مجموعہ ہے جس کی ابن سینا کے قانون طب کی طرح مابعد کی نسلوں نے صرف یوں توضیح کی۔ کہ وہ کئی ایک علماء ادب کی سعی کا ماحصل ہے۔

ہمیں اس کا بہی پورا پورا علم نہیں کہ کوفیوں اور بصریوں میں کیا خاص فرق رہا۔ بصرہ کے نحویوں نے مابعد تعداد ادیوں کی طرح۔ مسائل نحو میں قیاس کو بڑی جگہہ دی ہوگی۔ مگر کوفیوں نے بہت سے محاورات کو جو قیاس سے مختلف تہے۔ جائز رکہا۔ اس حیثیت سے بصریوں اور کوفیوں میں فرق کرتے ہوئے مقدم الذکر کو (اہل منطق) کہا گیا۔ ان کا اصطلاحی اسلوب تفصیل میں کوفیوں سے جدا ہے۔ بہت سارے لوگ جن کے سروں میں (خالص عربوں کے خیال کے مطابق) منطق کا سودا سما رہا تہا۔ زبان کی نکتہ چینی میں حد سے متجاوز ہوگئے تہے۔ مگر دوسری طرف وہم وتخیل نے قاعدہ کی شکل اختیار کرلی تہی۔

یہہ محض اتفاقیہ امر نہیں کہ بصرہ نے سب سے پہلے منطقی ذرائع سے فائدہ اٹہایا۔ بہ حیثیت مجموعی وہ بصرہ ہی تہا۔ جہاں اول ہی اول فلسفہ کے قوانین کا اثر نمایاں ہوا۔ اور جہاں کے نحویوں میں شیعی اور معتزلی دونوں کا عنصر تہا۔ جنہوں نے بہ طیب خاطر اجنبی فراست کا اثر اپنے عقائد کی تعلیم پر ہونے دیا۔

علم نحو۔ جب کہ وہ مترادفات اور مثالوں کے جمع کرنے تک محدود نہ تہا۔ اور جبکہ اس میں خاص مسائل کے متعلق بحث ہوتی تہی تو اس میں ارسطاطالیسی منطق کا اثر ظاہر ہوتا تہا زمانہ اسلام سے پہلے ہی سیریوں (شامیوں) اور ایرانیوں نے ارسطاطالیس کے رسالہ منطق پر تہری ایساگوجی کے ساتہہ ستوئک[۱] اور نو افلاطونی[۲] فلسفہ کا بہی مطالعہ کیا تہا۔ چنانچہ ابن المقفع

---

[۱] فلسفیوں کا ایک گروہ کا نام ہے جسکا سرگروہ زینو تہا۔ اس نے ستوئک فلسفہ کی بنیاد ۳۰۸ ق م میں شہر ایتھنز میں ڈالی جسکا مقصد یہ تہا کہ نیکی سب سے بلند پایہ چیز سمجہی جائے۔ تمام دنیا اخلاق میں گہتار ہے جذبات کو قابو میں رکہا جائے۔ اور خوشی وغم دونوں حالتوں میں بے پرواہ رہیں۔

[۲] وہ مسائل جو تیسری صدی عیسوی میں افلاطونی خیالات اور مشرقی روحانیات کا مجموعہ تہے۔

(متوفی تقریباً ۲۴۲ھ) نے جس کو خلیل سے پہلے گہر دوستانہ تہا۔ ان سب باتوں کو جو زبان پہلوی
میں ان قسم منطق یا نحو تھیں عربوں کے لئے سہل الحصول بنا دیا۔ اور اسی لحاظ سے مختلف جملوں کی
قسمیں کبھی پانچ اور کبھی آٹھ یا نو اور سات بہی کلمہ کی اقسام ثلثہ اسم و فعل و حرف گنا دیں
بعد میں چند فضلا۔ مثلاً جاحظ (متوفی ۸۶۹ء) وغیرہ نے منطقی قضایا کو بلاغت کی قسموں میں
شریک کر لیا۔

زمانہ مابعد میں صورت اور تصور کے بارے میں بڑی بحثیں ہوئیں۔ اور اس مسئلہ پر بڑی
تکرار ہوئی۔ کہ آیا زبان حکومت کا نتیجہ ہے۔ یا طبعی ماحصل؟ مگر رفتہ رفتہ فلسفی رائے نے غلبہ
حاصل کیا، کہ زبان زور حکومت کا نتیجہ ہے۔

منطق کے بعد نحو میں ریاضیات کے اثر کا پتہ چلتا ہے۔ معمولی روزمرہ اور قرآن یا کسی کے
موزوں کلام کی نثر کی طرح شعرا کے اشعار نہ صرف جمع کئے گئے۔ بلکہ خاص خاص اصولوں کے
تحت میں مثلاً بحور کا لحاظ کرتے ہوئے انکو ترتیب دیا گیا۔

علم نحو کے بعد علم العروض کی بنا بڑی۔ خلیل (متوفی ۷۹۱ء) معلم سیبویہ
(جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس نے علم نحو میں سب سے پہلے قیاس کو دخل دیا تہا۔) کی نسبت
کہا جاتا ہے کہ اس نے بحور کا بہی ایجاد کیا۔ جب قومی اور قدیمی عادات کے لحاظ سے زبان عرب میں شاعری کا
ایک عنصر مانی گئی، تب یہہ خیال پیدا ہوا کہ وہ چیز جو فطری ہو اور تمام لوگوں میں عام ہو بحور میں
پائی جا سکتی ہے۔ اسلئے ثابت ابن قرۃ (پیدائش ۸۳۶ء وفات ۹۰۱ء) اپنی تقسیم علوم میں
بیان کرتا ہے (کہ بحر ایک مہم شئے ہے۔ اس کا مطالعہ ایک طبیعی علم اور بدین وجہ وہ فلسفہ کی اک
شاخ ہے۔

باایں ہمہ علم نحو گو وہ زبان عربی تک ہی محدود تہا، اپنی خصوصیات کو باقی رکھا۔
جنکے ذکر کا یہہ محل نہیں ہے۔ بہر حال وہ (نحو) عربوں کی زیرکی، ان کی عمیق نظر اور کاوش سے
جمع کرنیکا ایک ایسا مجموعہ ہے۔ جس پر عرب بجا فخر کر سکتے ہیں۔ دسویں صدی کا ایک حامی دین

مسیح (APOLOGIST) جو یونانی فلسفہ پر حملہ کرنے میں منہمک تہا۔ کہتا ہے کہ "ہر وہ شخص جسکو عربی شعر و نظم کی گہرائی اور باریکی سے واقفیت ہو۔ خوب جانتا ہے کہ یہہ ایسی چیزوں شلاً اعداد خطوط اور نقطہ سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہیں۔ وہ لوگ جو اشیاء کی حقایق تک پہنچنے کا بے معنی خواب دیکہتے ہیں ان کو (اعداد خطوط و نقطہ اپنی رائے کی حمایت میں دلیلاً پیش کرتے ہیں۔ میں ان چیزوں اعداد، خطوط۔ اور نقطہ میں کوئی ٹھوس فائدہ نہیں دیکہتا جبکہ باوجود قلیل نفع کے وہ اعتقادِ مسیحی کیلئے ضرر رسان اور ساتہہ ہی ایسے بد نتایج ظاہر کرتے ہیں جنکے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے ہمیں خدا سے مدد مانگنی پڑتی ہے"

وہ لوگ جو زبان کی ادنیٰ سی ادنیٰ خوبی سے حظ اٹہاتے تہے نہیں چاہتے تہے کہ ان کی اصلی زبان کا ایک جزو بہی فلسفیانہ خیالات سے تہ و بالا ہو جائے۔ اس لئے بہت سارے الفاظ (جنکو اجنبی تصانیف کے مترجمیں نے ایجاد کیا تہا) کی صورت کو زبان پرست نحویوں نے نفرت کی نگاہوں سے دیکہا۔

خوش نویسی کے جمیل فن نے (جس میں عام عربی فنون (آرٹ) کی طرح۔ بجائے اساسی کام کے ظاہری نقش و نگار زیادہ تہا) عمدہ اور دیدہ زیب شکلوں میں بڑی ترقی کی۔ اور اس کا پہیلاؤ زبان کی علمی تحقیقات کی نسبت کہیں زیادہ رہا۔

عربی گفتگو کے اسلوبوں میں ہم اب تک اس زیرکی اور دور رسی کو پاتے ہیں جنہوں نے ان کو ایجاد کیا۔ گو ساتہہ ہی ساتہہ اک گونہ قوت کا فقدان پایا جاتا ہے جو عرب کے تمام کلچر (تہذیب) کی ترقی میں نمایاں ہے۔

ماخوذ از ہسٹری آف فلاسفی ان اسلام

مولفہ ڈاکٹر۔ ٹی۔ جے۔ ڈی بوائر۔

عبدالقادر

سلہ۔ نہ معلوم اس سے مولف کی کیا غرض ہے۔

غزل
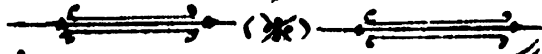
رند مشرب دل میرا ہر رنگ میں دیوانہ تھا
برہمن سے دوستی تھی شیخ سے یارانہ تھا

جب مصیبت آ پڑی مجھ پر تو تھے سب دور دور
ہر یگانہ پھر تو مجھکو صورت بیگانہ تھا

اب تو رسوائے جہاں ہے ورنہ یہ دل کیا کہوں
لاکھ فرزانوں میں فرزانہ یہی دیوانہ تھا

بن سنورنے کا انہیں تھا مشغلہ آٹھوں پہر
گیسوئے پرخم تھے یہ تھے آئینہ تھا شانہ تھا

دست قاتل جب بڑا دستے یہ سب تھرا گئے
قتل گہ میں جوہر شمشیر کچھ چمکا نہ تھا

دیکھئے ساقی نے مے کسوقت کی مجھ پر حرام
جبکہ پیمانہ میرے ہونٹوں تلک آیا نہ تھا

بیدلی میں آہ و زاری سے نہیں کچھ فائدہ
دے کے دل غم مول لینا کیا کوئی سودا نہ تھا؟

ہائے ظالم نے مرے دل کی خبر کس وقت لی
دیدۂ تر جب کہ اک چھلکا ہوا پیمانہ تھا

اس قدر میں محو تھا احسن خیال یار میں
سرمدی کا شور مجھکو نغمۂ مستانہ تھا

احسن

اسپورٹس

کئی حضرات نے ہم سے فرمایش کی ہے کہ "اسپورٹس" کیلئے میگزین میں چند خاص صفحات مقرر کئے جائیں ہمیں معلوم نہیں یہہ فرمایش کہاں تک مقبول ہوگی آیندہ اسکے متعلق غور کیا جائیگا۔

اس سلسلہ میں یہ خبر طلبہ قدیم کیلئے باعث دلچسپی ہوگی کہ "نواب سالار جنگ بہادر" کرکٹ ٹورنمنٹ" کے قبل میاچ میں میڈیکل کالج کے خلاف نظام کالج کو نہایت اچھی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

اگر طلبہ قدیم کیلئے ایسی خبریں باعث دلچسپی ہیں تو ہمیں آیندہ اُن کے شائع کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔

انتقاد اور اس کے چند اصول

اکثر لوگون کا خیال ہے کہ فن تنقید نہایت سہل ہے۔ یہی وجہ ہو گی کہ آئے دن ہم چند رسالون میں بعض ایسی باتیں دیکھہ لیتے ہیں جنکو پڑھکر خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے۔ ساتھہ ہی ساتھہ کچھہ تاسف بھی ہوتا ہے ہنسی اسوجہہ سے آتی ہے کہ آجکل کے نقّاد بجائے انتقادِ حقیقی کے بچون کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں (اس جملے کی وضاحت کی ضرورت نہیں اسلئے کہ جو اچھا ذوق رسالون کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ہمارے اس جملے کو بخوبی سمجھہ جائیں گے) تاسف اسوجہہ سے ہوتا ہے کہ تنقید کے وقت انکی عقل سلیم ان سے کوسوں دور رہتی ہے ورنہ کوئی وجہہ نہیں کہ باوجود عالم و فاضل ہونیکے ان کے قلم سے ایسے جملے نکل آئیں جو انکی شانِ علمیت اور تزکِ فضلیت کے شایاں نہوں۔

ہماری ہان آجکل انتقاد کی وہی حالت ہے جو انگلستان کی سولھویں صدی عیسوی میں تھی۔ اگر اہل فرنگ نے اوس زمانہ میں اس قسم کی تنقید اختیار کی بھی تو قابلِ فروگذاشت تھی کیونکہ اس وقت اس میدان میں ان کی رہنمائی کرنیوالا کوئی نہ تہا لیکن ہم ان عیوب سے بچ سکتے ہیں۔ جب ہمارے سامنے انتقاد کے صحیح صحیح اصول موجود ہیں تو کوئی معنی نہیں کہ ہم ان سے کام نہ لیں سچائی اس بات کی مقتضی ہے کہ اچھائی چاہے وہ غیر اقوام ہی میں کیوں نہو قابل تقلید ہے "کیونکہ" نقل کفر کفر نباشد" ہم لوگوں کو حسد۔ بغض۔ ریاکاری تعصب ان تمام نے کوتاہ نظر بنا رکھا ہے اسلئے ہمیں اب اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہماری نظر فراخ اور ہمارے خیالات میں وسیع ہو جا وہ تعلیم ادھوری سمجھی جائیگی جو انسان میں یہ دو باتیں پیدا نکر سکے اگر یہ نصیب ہو گئیں تو سمجھنا چاہئے کہ ہر کسوٹی پر کھرے ثابت ہونگے ہماری رائے صائب ہو گی اور ہمارا موازنہ صحیح انتقاد کا پہلا اصول جسکو ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہئے۔

وہ یہہ ہے کہ نقاد مصنف کے دائرہ ذاتیات میں بھولکر بھی قدم نہ ڈالے اور طعن و تشنیع سے ہرگز کام نہ لے یطلب یہہ ہے کہ مصنف کے خانگی حالات اور طرز معاشرت فطری کمزوریوں اور انسانی خامیوں کو درگذر کرے اسکی تصنیف پر نقاد ادبی پہلو سے نظر ڈالے اسکے حسن و قبح دونوں بیان کرے۔ اگر داد کا مستحق ہو تو دل کھولکر داد دے۔ اگر لایق تحسین ہو تو اسکو اسکی خامیوں سے اس طرح متنبہ کرے کہ احساسات زخمی نہ ہونے پائیں۔ اور آئینۂ دل کو ٹھیس نہ لگے۔ کام اس طرح سے لیا جائے کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ دوسرے الفاظ میں حد اعتدال پر قایم رہے۔ جس انتقاد کی بنا ذاتی خصومت پر ہوتی ہے وہ آخر ش لچر پوچ ہی ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں نقاد اندھا بن جاتا ہے۔ خوبیوں کو بالا طاق رکھکر عیب جوئی پر کمر باندھتا ہے۔ دنیا بھلا ایسے فیصلہ کو کب مانتی ہے۔

ہماری ناقص رائے میں نقاد میں حسب ذیل اوصاف کا ہونا ضروری ہے:۔

تحمل و بردباری۔ اگر اس کا خوگر نہ بنایا جائے تو بحث مباحثہ کا لازمی نتیجہ تو تو میں میں کے سوا کچھہ نہ ہوگا۔

ہمدردی۔ اگر یہ نہ ہو تو فیصلہ یکطرفہ کہلائیگا۔

متانت۔ مخالفین پر اس کا بڑا اخلاقی اثر پڑتا ہے۔

ذوق سلیم اور مذاق لطیف۔ ان کے بغیر نکتہ سنجی اور تنقید غیر ممکن۔

تخیل۔ اسکو بھی بڑا دخل ہے۔ کیونکہ جس مصنف کی تصنیف پر یا جس شاعر کے کلام پر تنقید کرنی چاہیئے ہیں اوس زمانہ کے حالات سے بھی واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ عموماً عوام پر اور خصوصاً مصنفوں اور شاعروں پر ماحول کا بہت کچھہ اثر پڑتا ہے۔

اب ہم انتقاد کے چند اصول یہاں مجملاً بیان کرتے ہیں۔ ان پر پابند ہونا نہ ہونا اختیاری امر ہے۔

(۱) ذوق سلیم اور مذاق بے تعصب حاصل کرنیکی سعی فرمائے۔ جن نکات کی آپ سے بہتر اور زیادہ تجربہ کار ادیبوں نے تعریف کی ہے۔ انکو سمجھنے کیلئے ہر پہلو سے نظر ڈالیئے۔ ممکن ہے کہ یہ خوبیاں آپکو پہلے پہل نظر نہ آئیں۔

(۲) ہر طرز تحریر کو مرعوب جانئے۔ برگشتہ خاطر ہو کر مطالعہ نہ فرمائے۔

(۳) اپنے ذاتی احساسات کو ادبی جانچ پرتال میں مداخلت بیجا کا موقع دیجئے اگر چھوٹے سے چھوٹے مصنف سے بھی آپکو کسی قسم کی مدد ملی ہو تو اظہار تشکر میں تامل نہ کیجئے لیکن اس شکرے کو ادبی فیصلہ کا جامہ نہ پہنائے۔

(۴) اپنی اپنی پسند میں شرمانیکی کوئی بات نہیں لیکن اس کو آخری نہ سمجھئے کیونکہ آدمی کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے اس میں غیر محسوس تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اٹھارہ برس کی عمر میں جو چیز ہمیں لبھاتی ہے وہ چھتیس برس کی عمر میں نہیں بھاتی اسیطرح ممکن ہے کہ چھتیس برس کی عمر میں ہمیں جس چیز سے الفت ہو اس سے چون برس کی عمر میں نفرت ہو جائے۔ غرض ہماری پسند میں یکسانیت نہیں ہوتی اور نہ ہونی چاہئے۔ (ع) ترقی تدریج حاصل کرنی ہے اور یقین ہے کہ سب سے آخری مذاق اوروں کے مقابل میں زیادہ صحیح ہوگا۔

(۵) اگر آپ کسی مصنف کی جسکی قابلیت میں نقادوں کو پورا اتفاق ہو۔ داد دینے اپنے کو قاصر سمجھتے ہیں تو انکساری کے ساتھ مان جائے کہ شاید غلطی آپ ہی کی ہے۔

(۶) ادبی ریاکاری سے بھی سخت احتراز کیجئے یعنی جس چیز کو آپ پسند نہیں کرتے اسکی جھوٹی واہ واہ نہ کیجئے۔ جو باتیں فی الواقع قابل تعریف ہوں ان کی بلا پس وپیش اور بلا کم وکاست داد دیجئے لیکن قطرہ کو دریا نہ کر دکھائے جو باتیں قابل گرفت ہوں انکی ضرور گرفت کیجئے لیکن ذرہ کو آفتاب نہ بنائیے۔

سید احمد علی ادیب

Page 79

The Nizam College
Urdu Magazine.

Thy Silent thoughts.

So beautiful are thy unspoken thoughts
I would watch thine eyes all day.
There is wonder in them as the sun's first flash
Through tumult of ocean spray;
In them the shining calm of upland pools
Mirrors the glory round.
And their shadows are the shadows of sweet flowers
Upon the summer ground.
So beautiful are thy unspoken thoughts
I would watch thine eyes all day;
More beauteous in their silence than the stars,
Than the silent stars, are they.

From "The Well of Memory."

E.E SPEIGHT,
B.A. (Lond.)

خیالات لطیف

حسین کس درجہ ہے سازِ خیالاتِ لطیف اسکا
ابھی تک تارِ مضراب تلفظ سے ہیں بیگا
جمیل آنکھیں کہ جنکے دوشِ نازک پر ہے یہ بربط
ہیں اس قابل کہ انکو شام تک میں دیکھتا
ہے انمیں وہ طلسم انگیز کیفیت جو ہوتی ہے
خطوطِ اولیں مہر کی برق جمالی
سما جاتی ہے بحرِ مضطرب کے جو رگ و پے میں
متانت آب و تابِ چشمہ کی اُن میں جھلکتی ہے
جو گرد و پیش کی آئینہ دار شان و شوکت ہے
رخِ رنگیں پہ اس طرح سے وہ سایہ افگن ہیں
زمینِ باغ پر جسطرح دو پھولوں
حسین کس درجہ ہے سازِ خیالاتِ لطیف اوس کا
ابھی تک تارِ مضراب تلفظ سے ہیں
جمیل آنکھیں کہ جنکے دوشِ نازک پر ہے یہ بربط
ہیں اس قابل کہ انکو شام تک میں دیکھتا
یہی وہ نرگسِ جادو بصد انداز مدہوشی
زیادہ خوبصورت ہیں کہیں طفلانِ انجم سے
اگرچہ اس گھڑی وہ بھی ہیں محو خود فرام

مسلم

(※)
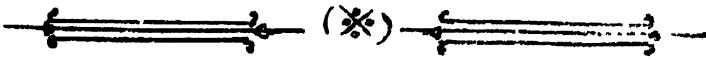
مدارس کی تعلیم میں یقیناً یہ بڑا نقص ہے کہ عملی زندگی کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ عمل
تخیل میں ہمیشہ باہم اختلاف رہتا ہے اور کبھی دونوں کا ڈانڈا نہیں ملتا۔ خیالی و فرضی باتوں پر توجہ
مبذول رہنے کی عادت ذہن کو جرأت اور جد و جہد سے عاری کر دیتی ہے۔ افسانوں اور سراب
آسا امور کی جانب خیالات کا رجحان رہنے سے جنہیں صرف متوقعہ مسرت اور خود اپنے ہی خیالات کی
پیروی ہوا کرتی ہے ہم میں تنک مزاجی زنانہ پن تعیش اعتراضات و اختلافات سے برافروختگی
پیدا ہو جاتی ہے اور ہم اس قابل نہیں رہتے کہ اگر کبھی قسمت پلٹا کھائے تو اوسکا وار برداشت
کر سکیں کیونکہ محض خیالی و فرضی توجیہہ اور واقعات بعیدہ کے انہماک کی وجہ سے ہماری حیثیت
ایک تماشائی کی سی ہو جاتی ہے جس سے واردات کے نظارہ کے ماسوا اور کوئی دلچسپی و تعلق
نہیں ہوتا۔ کوئی ذریعہ ایسے امور کے دفعیہ کا موجود نہیں ہوتا۔ ایسے واقعات پر کوئی آمادگی یا
انکے دور کرنیکی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور نہ اتنا حوصلہ ہوتا ہے کہ اگر ایسے ذرائع حاصل
ہوں تو ان سے استفادہ کر سکیں کسی امر کے متعلق قطعی فیصلہ کرنے سے قبل ہم چون و چرا کے
گورکھ دھندے میں پھنس جاتے ہیں اور اس طور پر وہ موقع ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ کسی
مقصد کے حصول برآری کیلئے ہم اسی سوچ بچار میں رہتے ہیں کہ کیا تدابیر اسکے باحسن وجوہ
انجام پانے کیلئے عمل میں لائے جائیں۔ ہمارے اس انہماک خیال میں موقع ہاتھ سے نکلجاتا ہے
اور ہم پڑے پچتایا کرتے ہیں اور دوسرے اپنے بھونڈے ہاتھ بیخوف و خطر اسپر ڈالدیتے ہیں
اسوقت خود بین نوجوان کو بادلِ نخواستہ یہ سبق سیکھنا پڑتا ہے کہ دنیا کا طور طریق اسکی اپنی

چال ڈھال سے مختلف ہے اور نہ دنیا والوں کے خیالات اسکے خیالات کے پابند ہیں۔ اس لحاظ سے غالباً قدیم خانقاہوں کی درسگاہیں اس قدر نادان نہ تھیں جس طرح تنہائی کی زندگی کے عادات اور اوھام پرستی سے انکا آغاز ہوتا تھا۔ اسی نہج پران کی تمام زندگی بسر وختم ہوجاتی تھی خانقاہ والوں نے اپنی زندگی کو دوسری عامیانہ زندگی سے بالکلیہ مختلف وتمیز رکھنے کی غرض سے خاص اپنی روش اختیار کر رکھی تھی۔ موجودہ مدارس کے طلبا اپنی کتب وتخیل کی بنا پر انسان اور اشیا کا ایک غلط نقشہ جما لیتے ہیں اور اگر تجربہ کاری اور بالغ النظری سے انکی دیکھ بھال نہ کیجائے تو وہ اسی جال میں پھنسے رہتے ہیں شروع میں طرق زندگی کا اتنا ہی بلند معیار قایم کرلیتے ہیں جیسا بعد میں چلکر غیر متوقعہ ناکامیابی کے باعث اس میں پستی واقع ہوتی ہے اس قسم کے خیالی یا فرضی مالی خولیا اور شعرا اور واعظین کے تخیلات کا وجود (دونوں کے دونوں چیزوں کی حالت موجودہ کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ متوقعہ کا) فسانہ نویسی اور مضمون نگاروں کے زور قلم کے بدولت ہے۔

مناسب یہہ ہے کہ چیزوں کو ان کی اصلی رنگ روپ میں دیکھا جائے نہ یہہ کہ آیندہ کے متعلق بلند پروازی سے کام لیا جائے۔ کسی سڑک کے متعلق بہترین علم اس وقت ہوسکتا ہے جب اس پر سے گذر ہوا ہو ہزاروں اتے پتے سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی کاروبار زندگی جداگانہ اور انفرادی حیثیت سے خیالی منصوبوں کے مقابلہ میں بہ عمدگی انجام پا سکتے ہیں انسانوں کو ہزاروں ایسے امور پیش آتے ہیں جنکا انہیں از خود وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور خود انھیں جن چیزوں سے دلچسپی اور شغف ہوتا ہے اسکی مطلقاً دوسروں کو پرواہ نہیں ہوتی اچھائی برائی سمجھ اور ناسمجھی کا باہم اختلاط اور اون کے مختلف مظاہر جس طرح تمہیں نظر آئیں گے۔ کتب اخلاق کی رنگ آمیزیاں ان سے معرا نظر آئیں گی۔ کوئی شخص ہر وقت اور ہر معاملہ میں یکساں دانشمند باخبر وہوشیار نہیں ہوتا اور بہت کم نظیریں ایسی ملیں گی کہ انسان بالکلیہ ناسمجھ پایا جائے۔

اگر تمہیں کاروبار دنیا میں شامل ہونے پر ایسے اشخاص سے مدبھیڑ ہو جو مختلف مباحث پر بہ عمدگی تقریر کر سکتے ہوں تو اس امر سے متعجب ہو کیونکہ ایسے اشخاص کی معلومات بالراست کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی پہلی بات تو یہ ہے کہ کتابوں کی روشنی دنیا میں زیادہ تر ہمکلامی کے باعث پھیلی ہے اور یہ معلومات دوسرے درجہ کی ہیں علاوہ بریں معمولی عقل و تمیز کسی کی خصوصی ملکیت نہیں ہیں اہل دنیا کیلئے ہی تجربہ اور تعمق اسی طرح شاہ راہ معلومات ہیں جس طرح زاویہ نشینی طلبا کے لئے اگر تمہیں اصول اور مبادیات کا علم ہے تو اس شخص کو روشن زندگی کی تقلیبات پر عبور ہے۔ اگر کوئی شخص کسی لڑائی میں شامل ہوا ہو تو وہ اسکے چشم دید واقعات کو اس سے زیادہ وضاحت وخوبی سے بیان کرے گا جیسا اسکے متعلق نقادان سخن نے خامہ فرسائی کی ہو۔ یا اگر کسی شخص کو کوئی کام عملی طور پر آتا ہو تو گو وہ اسکے متعلقہ شعبہ علم کیساسے واقف نہ ہو لیکن عملاً وہ اسے بہ عمدگی انجام دے سکیگا۔ پڑھے لکھوں کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ کتابوں کے سوا اور کہیں علم کا وجود ہی نہیں۔ میں تمکو صلاح دیتا ہوں کہ اس خیال خام میں نہ پڑنا تاکہ آیندہ جبکہ ہمیشہ اپنی غلطی سے متنبہ ہونے کی تکلیف و ندامت برداشت نہ کرنا پڑے جسکا اس مغالطہ میں پڑے رہنے کی صورت میں پیش آنا لازمی ہے۔

سنجیدگی روشن زندگی کے لئے جزو اعظم ہے اور غالباً اس سے بالکلیہ قطع تعلق کرنا محال ہے بہت کم اشخاص ایسے ہوں گے جو اس کسے متاثر نہ ہوتے ہوں بہرحال یہ لازمی امر ہے کہ اخلاق ذمیمہ کی نمایش نہ کیجائے اپنے آپ کو قابل مضحکہ بنا کر ممتاز بننے کی کوشش نہ کرو نہ یہ قابل نفرین خیال دل میں لاؤ کہ نقل محفل بنکر ہم چشموں میں ہر دل عزیزی پیدا کیجائے کسی ذہنی یا اخلاقی معیار کو مدنظر رکھنے سے اوس کی خوبی کے متعلق تمہیں اظہار مذاق و وقعت کا موقع ملیگا بعض ایسے اشخاص بھی ہیں جو اپنی خوبیوں کو اس بری طرح پر اظہار کرتے ہیں اور اپنے اس برتاؤ کے جانب کم التفاتی برتتے ہیں کہ عام طور پر لوگوں کی نگاہ میں وہ نہیں جچتے۔ بخلاف اسکے بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنی خامیوں کو

پوشیدہ رکھتے ہیں اور اون کی فہم و فراست عام طور پر تسلیم کیجاتی ہے۔ یا وہ گوئی اور زیادتی
کلام سے محترز رہو۔ جیسا رنگ دیکھو ویسا ہی رنگ اختیار کرو ہر شخص سے بکشادہ پیشانی
پیش آو۔ اور ملنے جلنے میں کوتاہی نہ کرو۔ جب تمہیں کچھہ کہنا ہو تو اس طرح کہو کہ اس سے
کسی کی دل شکنی نہ ہو اور نہ خود تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ بعض خیالات اپنے ہی تک
محدود رکھو دوسرون کے متعلق جو کچھہ سنو اسکا اعادہ اون کے روبرو نکرو۔ اگر خود تم کوئی بات نکرسکو یا کوئی
خیال ظاہر نہ کرسکو تو ظریفون کے ساتھہ شریک ظرافت ہو عقلمندونکی ہاں میں ہاں ملاو تو وہ تمہارے متعلق
برا خیال قایم نکرینگے جن امور سے تمہیں واقفیت ہو اون کے متعلق جو کچھہ کہا جائے اوسے سنو۔
یہہ نہ کرو کہ جو مضمون تمہاری دلچسپی کا ہے اسکے متعلق خود ہی سلسلہ کلام آغاز و جاری
رکھو۔ متقدم الذکر صورت میں تمہارے نام آوری ضرور ہوگی لیکن تمہیں خود کسو کوئی فایدہ
حاصل نہ ہوگا جن مباحث پر میں نے قلم اٹھایا ہے انکے متعلق خود سلسلہ کلام آغاز کرنے
میں مجھے حجاب مانع ہوتا ہے۔ اپنے ہی تک کے مضامین و مباحث پر گفتگو کرکے حاضرین جلسہ پر
فوقیت حاصل کرنا اور جو لوگ ان سے ناآشنا ہیں انہیں استعجاب میں ڈالنا اتنا دشوار
نہیں جتنا کسی جلسہ میں باری باری سے ہر شخص سے یکسان طریقہ پر مختلف مضامین پر گفتگو کرنا۔

دلائل و براہین کے پیچون میں پڑنا نادانستگی ہے اگر تم اس سے عاری ہو تو
ارتباط اور میل جول میں (جسکو میں زیادہ پسند نہیں کرتا) تمہیں اس عادت کو ترک کرنا پڑیگا
بجائے اس کے کہ سامعین کو اپنا ہمنوا بناو۔ یا کج بحثیوں سے انہیں منواو مناسب ہے
کہ اگر کسی امر کے متعلق تمہارا اپنا کوئی خیال ہو تو اوس کو محض بہ حیثیت رائے ظاہر کردو
دوسروں کی رائے سے اصل معاملہ کے متعلق اتفاق کرنے اور اون کا سلسلہ خیال برقرار
رکھنے سے تمہیں بہت کچھہ سبق حاصل ہوسکتا ہے جو ان سے اختلاف کرنے اور انہیں انکی
رائے کے خلاف مجبور کرنے سے نہیں ہوسکتا۔ الگ تھلگ رہنے یا مفر ڈال لئے ہوئے بیٹھنے سے
محترز رہو۔ تذبذب و نازک خیالی کے بجائے علمی معلومات سے پختہ کاری نصیب ہوتی ہے۔

جو بات بخوبی سمجھ میں آجائے اسکے متعلق بہت کم بحث ہوا کرتی ہے معمولی سمجھ بوجھ اور تحقیق کے بجائے بحث و تکرار میں تضیع اوقات ہوتی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ لوگوں پر فوقیت ثابت کرنے سے تم لوگوں کو دوست بنا سکو گے۔ اس امر کو نہ تو کوئی قبول کریگا نہ اس سے درگذر بجز اس صورت کے کہ پچھلے سے تمہاری دھاک بندھی ہو جس کی وجہ سے اس قسم کی نمود قابل عفو تصور کیجا سکے یورد تحسین بننے بجائے لوگوں کو اپنا خیر خواہ بنانا زیادہ مناسب ہے اس مدعا کے حصول میں نہ تو اپنے حقوق جتانے میں سخت گیری کو کام میں لاؤ نہ ان کی کمزوریوں سے مستفید ہونیکی جانب مائل ہو۔

اپنے سے بلند مرتبہ اشخاص کی صحبت کے شایق نہ ہو نہ بڑے لوگوں کے حاشیہ بردار ہو دونوں صورتوں میں حقیقی ہمدردی مفقود ہوتی ہے متقدم الذکر تمہاری موجودگی کو ایک رکاوٹ متصور کرینگے اور موخر الذکر کی نگاہ میں تمہاری حیثیت ناخواندہ کی ہوگی اور ایک قسم کا بار سمجھے جاوگے کسی صحبت میں ذکاوت و فراست کی وجہ سے ممتاز بنکر شامل ہونا درست نہیں تم سے خواہ مخواہ لوگ رشک کرینگے۔ اگر تم کچھ نہ ہوا اور معمولی سادگی اور اخلاق کا برتاؤ کرو تو ایسی صحبتوں میں تمہاری شرکت کی ضرورت نہیں اگر تم بہ تصنع اپنی برتری کا اظہار کرو تو یہ سخت بدتمیزی ہے جسکے برتنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ اگر تم صرف اس امر پر اکتفا کرو کہ اچھائی برائی سے کوئی تعلق ہی نہ رکھو تو لوگ تم سے گریز کرینگے اگر تم اپنے آپ کو برتر ثابت کرو اور اوں کے مقابلہ میں علمیت ظرافت یا خوش مذاقی کا اظہار کرو تو وہ تم سے تنفر کرینگے۔ کسی صورت سے تمہیں مفر نہیں ہیں گفتگو کرنے کے بمقابلہ نغمہ سرائی پسند کرونگا ہر شخص خوش گلو ہونے کا مدعی نہیں ہوسکتا لیکن ہر شخص یہ ضرور سمجھتا ہے کہ دوسرے کے مانند وہ بھی ذی عقل و ذی شعور ہے اس قسم کے میل ملاپ کا راز اب فاش ہوگیا ہے۔ بڑے لوگ پڑھے لکھوں کو بہت کم مدعو کرتے ہیں وہ جسطرح دل بہلانیکے لئے بندر و طوطے پالتے ہیں اسیطرح گویوں اور سازندوں سے صحبت گرم رکھتے ہیں۔

(ولیم ہزلٹ) (افضل حسین فاروقی)

انفعالِ معصیت

(۱)

سرما کی شام اپنا سوگوار۔ دامن مملکت فرانس کے ایک قریہ کی فضا پر متانت اور
سکوت کے ساتھ پھیلا رہی تھی۔ سردی کی شدت نے ہر سیال شئے کو منجمد کر دیا تھا زنگ
کلیسا کی مقدس اور حزن آفریں صدائیں شام کی سوگواری میں لحہ بہ لحہ اضافہ کر رہی تھیں
گاؤں کے متمول باشندے اور غریب دہقان وبیزر لبادوں میں لپٹے ہوئے عبادت گاہ کی
مقدس جوار رحمت سے نکلکر گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ اونکی روح میں غیر محسوس بالیدگی
پیدا ہو رہی تھی اور اون کے چہروں پر مسرت و ابتہاج کے آثار نمایاں تھے۔ برف باری کے
طوفان ایک وقفہ کے لئے تھم گئے تھے۔ تمام گھروں میں دئے جلائے جا چکے تھے جنکی
خفیف روشنی گرمیوں اور چولہوں کے دھوئیں میں عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی کلب سے
چالیس پچاس قدم کے فاصلہ پر سڑک کی قندیل کے نیچے پتھر کی ایک بھدی سی نشست بنی ہوئی تھی
جو تھکے ماندے مسافروں کے ستانے کے لئے بنائی گئی تھی اسی نشست سے ہٹ کر کسی
امیر کے باغ کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ جسکے سرے پر محافظ کتوں کا ایک مختصر مگر نہایت خوبصورت
گھر بنا ہوا تھا۔

ایک ضعیفہ جسکا سیاہ اونی لبادہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ایک متمول خاندان کی فرد ہے
گرجا سے نکلی اور اپنے مخملی خوبصورت کیسہ سے پیسہ نکالکر گداگروں اور مفلسوں کو دیتی ہوئی
اپنے مکان کی طرف بہ سرعت تمام جانے لگی جب وہ پتھر کی نشست کے قریب پہونچی تو یکایک
رک گئی اور دیکھا کہ ایک قوی الجثہ۔ ادھیڑ مرد جسکے چہرہ سے آثار پژمردگی ہویدا تھے۔
آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے اور رہ رہ کر اسکا تمام جسم سردی کے اثر سے کانپ اٹھتا ہے۔

برف وباران نے اُسکے بھدے اور فرسودہ لباس کو بالکل تر کر دیا تھا۔ اسکی پھٹی ہوئی استینوں کے ریشوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تہیں اور اس کی بد رنگ اور پُرانی ٹوپی کے کناروں پر برف کے گالوں کے کچھہ نشانات ہنوز باقی تہے۔ اسکے کندہے سے ایک کثیف تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ جسمیں غالباً اس کی کُل دنیوی کائینات محفوظ تہی ضعیفہ کے دل میں رحم و دلسوزی کے جذبات موجزن ہوئے اسلئے اس غریب اجنبی کو قریب جاکر مخاطب کیا۔

"بیٹا تم کون ہو یہہ اپنی کیا حالت بنا رکہی ہے۔ کیا تم سردی سے خوف نہیں کرتے۔"

نووارد نے انکھیں کھولیں، اور ایک حقارت امیز نظر بڑھیا پہ ڈالی۔ اور ایک حد درجہ درشت لہجہ میں کہا، "جاؤ اپنا کام کرو۔ اگر تمہیں سردی کا خوف ہے تو اپنے محلوں میں انگھیٹاں جلاؤ۔" یہہ کہکر اپنے طویل عصا کو زمین پر سے اٹھا لیا اور اسکے اطراف جو برف جم گئی تہی ناخنوں سے نکالنے لگا۔

رحم دل ضعیفہ کا دل بھر آیا، اور اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"میری اچھی خاتون تمکو مجھپر ترس آگیا۔ آہا کسقدر عجیب بات ہے"!

بھرائی آواز میں اس نے کہا۔ اور پھر کچھہ دیر ٹہر کر ایک طویل قہقہ لگایا ضعیفہ اس بے ہنگام اور کریہہ الصوت قہقہ سے چونک پڑی۔

"ایں تم ہنس رہے ہو؟ کیا تمہیں جنون تو نہیں ہو گیا؟

اس نے حیرت آمیز لہجہ میں کہا۔ اور دیوانگی کے خیال نے اسکو غیر اضطراری طور چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا۔

پھر ایک طویل مگر حد درجہ خشک اور مکروہ قہقہ .....!

"ہاں میں سڑی ہوں، دیوانہ ہوں۔ جا جا! بڑھیا اپنا رستہ لے!

جا اس سامنے والے تنکاری کتے سے پوچہہ۔ وہ کہیگا میں دیوانہ ہوں۔ مگر نہیں میں دیوانہ نہیں ہوں! تم سب رہزن ہو۔ ڈاکو ہو" اس نے ایک خشن لہجہ میں کہا۔ مگر مشکل سے

بڑھیا اسکو سن سکی۔

رحم دل ضعیفہ کی حیرت لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔ مگر رحم دلی اور ترس جو عہد ضعیفی کے نمایاں ترین خصوصیات میں سے ہیں اسکو دریافت حقیقت اور دستگیری پر مجبور کر رہے تھے۔

"بیٹا تم آخر ہو کون"؟ پھر اس نے جرات کر کے پوچھا۔

اجنبی نے بیزار ہو کر۔ نفرت ظاہر کرنے والے انداز میں گردن ہلائی۔

"میں کون ہوں؟ اس نے کہا" میں انسان ہوں۔ کیا تم نہیں دیکھتیں؟ نہیں نہیں میں انسان نہیں ہوں.... اگر میں انسان ہوتا مجھے اس قہوہ خانہ سے کیوں؟ اس شدید سردی میں نکال باہر کرتے؟ میں نے ان سے کہا میں مفت کوئی چیز نہیں مانگتا۔ پیسے لو اور جتنے میرے پاس ہیں لے لو۔ صرف ایک رات بسر کرنے دو۔ مگر نہیں مانا۔ کہا تم خونی ہو، بدمعاش معلوم ہوتے ہو، نکل جاؤ یہاں سے"۔ اور مجھے دھکیل کر باہر کر دیا اور دروازہ سخت بے رحمی کے ساتھ بند کر دیا"۔

اب اس کا چہرہ کھچنے لگا تھا۔ اور حزن و ملال کے آثار چھپائے نہ چھپتے تھے۔

"میں کون ہوں؟ میں حیوان ہوں! نہیں حیوان بھی نہیں ہوں۔ اگر حیوان ہوتا تو وہ شکاری کتا کیوں ڈراتا۔ دیکھو اس نے میری پنڈلی کو کاٹ کھایا ہے۔ میں نے جانا تھا کہ وہ چھوٹا سا گھر خالی پڑا ہوگا۔ میں وہیں رات گذار دونگا مگر اُف غریبوں کے ایسے کہاں نصیب کہ کتے کی طرح گرم اور آرام دہ مکان میں سرمائی ایام بسر کریں۔ میں کون ہوں؟ میں کوئی نہیں ہوں۔ میں سوا اسکے کچھ نہیں جانتا کہ کل صبح کو مجھے قید سے آزاد کر کے جاڑے کی صعوبتوں میں گرفتار کر دیا۔ اچھا خدا حافظ!" یہ کہکر اسنے اپنا تھیلا کندھے پر درست کیا اور لاٹھی سنبھالی ضعیفہ نے کہا "مگر ایسے وقت میں تم کہاں جاؤ گے؟ رات کہاں گذریگی"؟

"خدا کی زمین بہت کشادہ ہے" اسنے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا "گھنے درختوں کا سایہ غریبوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرتا ہے"!

"بیٹا! وہ کلیسا جو نظر آرہا ہے۔ نا".... اجنبی نے بات کو ایک قہقہ کے ساتھ قطع کر دیا۔ کیا کہا گرجا؟ میں اور گرجا! مجھ غریب مجرم گناہگار کا وہاں کیا کام ہے؟ وہ تو مالدار لوگوں کی روحانی تفریح گاہ ہے۔ وہاں متمولین۔ اپنے گناہ بخشوا لیتے ہیں۔ وہاں تو آیندہ جرائم کے ارادوں کی تجدید ہوتی ہے۔ میرا وہاں کیا کام ہے"؟ اس نے کہا۔ اور اس طرح کہ اوسکے لفظ لفظ سے ناامیدی اور نفرت ٹپک رہی تھی۔ "نہیں نہیں" بڑھیا نے کہا "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ کلیسا تو اب بند بھی ہو گیا ہوگا۔ مگر کلیسا کے پہلو میں جو عمارت نظر آرہی ہے۔ اس میں ایک اسقف رہتے ہیں۔ جو غریبوں اور مفلس مسافروں کے بے انتہا غمخوار ہیں، ادنکا دروازہ دن اور رات میں کبھی بند نہیں ہوتا۔ ہر محتاج اور رہو کا انکا مہمان ہے۔ تم بھی وہیں جاؤ"۔ یہہ کہکر اوس نے اپنے مخملی کیسہ سے دو فرانک نکالکر اجنبی مفلس کو دئے اور خداحافظ کہکر ضعیفہ نے اپنی شال احتیاط سے سر اور گردن پر اوڑہ لی۔ اور مکان کا رخ کیا۔

(۲)

گرجا کے دہنے بازو ایک مختصر سی عمارت اپنی ایک سو سال کی قدامت پر نازاں ہے۔ یہہ عمارت اسقف کلیسا کی قیام گاہ ہے۔

انقلاب فرانس کے پہلے اس بشپ کا خاندان شہر کے ممتاز اور ذی عزت خاندانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ مگر جب انقلاب کی ہواؤں نے قدیم وضع اور تمدن کی کایا پلٹ دی تو ایک نوجوان امیرزادہ نے اپنی بی بی کو قبر کے حوالے کر کے جو اسی زمانہ میں سینہ کے مرض میں گرفتار ہو کر مرچکی تھی، روما کو ہجرت کی۔ جب انقلاب کے شعلے خاموش ہو گئے تو نوجوان امیر زادہ ضعیف راہب کی ہیئت میں پھر ایک مرتبہ مادر وطن کی خدمت کیلئے فرانس چلا آیا اور اسی کلیسا میں ادنیٰ عہدہ دار مذہب کی حیثیت سے داخل ہوا اور رفتہ رفتہ اپنی مقدس خدمت، غریب نوازی، عام ہمدردی اور تیمارداری کی بدولت اسقف اعلیٰ ہو گیا۔ اب اسکی عمر تقریباً بہتر برس کی تھی اسکی ہمدردی اور مہمان نوازی ضرب المثل ہو چکی تھی اور اسکا مکان غریب مسافروں کیلئے وقف تھا۔

اسقف علی اپنی شام کی خدمت کو انجام دیکر مکان واپس آگیا تہا ابہی کہانیکے لیئے آدہ گھنٹہ اور باقی تہا کہ کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی "چلے آو" بہائی یہہ خداوند عیسی مسیح کا مکان ہے" اس نے منحنی نگر ایک ہوشیار آواز مین کہا۔

ایک طویل القامت اجنبی اپنی لمبی لاٹھی ٹیکتا ہوا اندر آیا۔ بشپ نے ہاتھ اٹھاکر دعا دی اور بے انتہا گرم جوشی کے ساتہہ اوسکو خیر مقدم کہا۔

بشپ نے اجنبی کو ایک کرسی پر بیٹھہ جانے کو کہا اور خادمہ کو آواز دی کہ ایک پیالہ دودہ اور ایک ظرف میں گرم پانی لائے۔

"جناب آپ سردی سے آرہے ہین اور مین دیکہتا ہون کہ آپ بہت تہک گئے ہین بیٹہہ جائیے۔ آپ ہاتہہ مونہہ دہوڈالین تو مین گرم کپڑے آپکے لیئے نکال لاؤن"....

بشپ نے مشفقانہ لہجہ مین کہا۔ اجنبی نے غصہ بہری آنکہین نکال کر اسقف کی طرف دیکہا۔

"تم مجہے چہیڑتے ہین ؟ مین "جناب" "کیا کہا جناب"

آج پہلی مرتبہ انیس سال کے عرصہ مین یہ لفظ اپنے بارہ مین سنا خوب! اچہا جناب! اجنبی نے ایک درد آمیز قہقہہ لگایا۔

اسقف حیران ہوکر "جی ہان" مین نے آپکو جناب کہا کیون اسمین تعجب کی کون بات ہے۔ کیا آپ انسان نہین۔ کیا آپ میرے بہائی نہین ہین کیا آپ خدا کے بندہ اور مسیح کی امت نہین ہین۔ کیا آپ ایک ذی عزت شخص" بس بس" اسنے ایک کرخت آواز مین کہا اپنی چہیڑ الگ رکہیئے مین انسان! مین معزز آدمی! مین بہائی۔ دل لگی اور چہیڑ کی کوئی حد ہے ؟ اسنے اپنی لاٹہی اور تھیلا کرسی سے اوٹہالیا اور راو رغصہ کی حالت مین دروازہ کا رخ کیا۔

ضعیف بشپ نے برق کی سی تیزی سے اسکو دروازہ مین جالیا اور اپنے تہرتہراتے ہاتہون کو پسار کر بے انتہا لجاجت کیساتہہ کیا صاحب مین نے کیا قصور کیا

خدا کے لئے مجھے معاف کر دو چلئے آج کی رات اس حقیر منزل مین بسر کیجئے مین آپ سے بے انتہا عاجزی کیساتھہ التماس کرتا ہون "

یہہ غیر معمولی شفقت، منت سماجت ایسا جادو نہ تہا کہ اجنبی کو مسحور نکر لیتا۔ وہ دروازہ مین ایک پیکر حیرت بنا ہوا کچھہ دیر کے لئے کہڑا رہا اور اسقف کی آنکھین ملاطفت اور پدرانہ محبت برسا رہی تہین۔ اسکا دل پسیج گیا اسکی آنکھون مین آنسو ڈبڈبا آئے اور خاموشی کے ساتھہ اسنے پھر میز کی طرف جاکر اپنا عصا اور تھیلا رکھدیا۔ اسی اثنا ءمین خادمہ گرم پانی کا ظرف اور دودہ کا کاسہ لے آئی اور اجنبی کے سامنے میز پر رکھدیا جسکی حیرت سرعت کیساتھہ بڑہ رہی تہی مگر بہوک اور پیاس کی شدت نے اوسکو کہانے کے معاملہ مین بے انتہا حریص کر دیا اور اوسنے بلا توقف کسے کا ٹھا اوٹھا کر منہ کو لگا لیا اور ایک ہی سانس مین اسکو خالی کرکے میز پر رکھدیا اور خود نیم بیہوشی کی حالت مین کرسی پر گر گیا جب کسی قدر ہوش و حواس بجا ہوئے تو دیکھا کہ گرم اور دبیز لباس پہنایا گیا ہے اور میز پر تیاری روٹی گرم آلو اور شوربا چن دیا گیا ہے۔

"آیئے اب سیر ہوکر کھانا کھائیے" بشپ نے دعوت دی اور دونون نے خوب سیر ہوکر کھانا کھایا۔" دسترخوان بڑھا یا گیا اور بشپ اجنبی کو اپنی سادہ اور بے تکلف خوابگاہ مین لے گیا جہان ایک سادہ سہری پڑی ہوئی تہی۔ سرہانے ایک میز رکھی تہی تین پرانی اور تقریباً شکستہ کرسیاں رکھی تہیں میز پر کچھہ کتابیں اور مقدس انجیل کے متعدد نسخے دہرے ہوئے تھے سارے اثاث البیت میں جس چیز کو قیمتی یا گران قدر کہا جا سکتا تہا وہ ایک چاندی کی شمعدان تہی جس میں ماہی کی بتیان جل رہی تہیں۔ اجنبی کی نگاہ سب سے پہلے جس چیز پر پڑی وہ یہی شمعدان تہی اسقف نے اسکو ایک کرسی پر بٹہایا۔ اور خود بہی اوسکے سامنے بیٹہہ گیا۔ اجنبی نے اپنے تھیلے سے ایک لمبی دہقانی وضع کی دری (پائپ) نکالی اور اسمیں تمبا کو بھر کر پینے لگا۔

(باقی آیندہ)
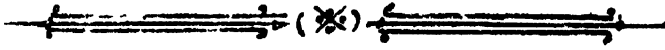
مسٹر ایف ۔ ایس ۔ ماروِن کا خیال ہے کہ انسانی دماغ اور تخیل روز افزون ترقی کر رہے ہیں۔
اب انسان کو اپنے تمام کام ساری تحقیقات اور سب معلومات ادہورے نظر آتے ہیں ۔ ہر نئی تحقیق
یہہ ثابت کرتی ہے کہ ہمیں ابھی بہت کچھہ معلوم کرنا ہے اور جو کچھہ کہ اب تک دریافت کیا گیا ہے
وہ ایک ادنی زینہ ہے اُس منزل کا جس تک رسائی سب حکیموں اور سائینس والوں کا مطمع نظر ہے
برعکس اسکے ہمارے اسلاف اپنے کام پر بیحد نازاں تھے اور انہیں کامل یقین تہا کہ انکی تحقیقات
میں آخر وقت تک کوئی نقص نہیں نکالا جاسکتا ۔ نیوٹن کو یقین تہا کہ جو کچھہ اسنے دریافت
کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور اوسکے قایم کردہ قوانین میں قیامت تک کوئی تبدیلی ناممکن ہے
ڈیکارٹ کا بہی یہی عقیدہ تہا ۔ مگر آجکل آینسٹین (EINSTEIN) سے اُن تمام پرانے
قوانین کی جڑیں کھوکھلی کردی ہیں ۔ اب ماہران سائینس کی یہہ کوشش ہے کہ اُن تمام مدارج کی
تاریخ اور حقیقت دریافت کریں جنکو طے کر کے کائنات کی تمام چیزیں اسوقت موجودہ صورت میں
جلوہ نما ہیں ۔ اگلے لوگوں کے خیال کے موافق آسمان سمندر اور پہاڑ کی حالت غیر متبدل تہی
مگر اب یہہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ ہر شئے کی حالت زمانے کے ساتھہ تبدیل ہوتی رہتی ہے ۔ یہہ کلیہ
انسان پر بھی عاید ہوتا ہے اور فطرت کے اس اصول کی حقیقت کا انکشاف تمام مسایل کو حل کریگا ۔

اُنیسویں صدی میں ڈاروِن کی تحقیقات نے یورپ اور امریکہ میں ایک ہلچل اور شور
مچا دیا تہا ابتدا میں اسکی سخت مخالفت کیگئی خصوصًا مذہبی پیشواؤں کی جماعت نے بڑی طرح

اُسکا پیچھا کیا تہا لیکن انکی کوشش سے اُسے کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ سائنس دان طبقہ اسکا ہم خیال ہوگیا۔ اور کچھہ دن بعد۔ یورپ کا بیشتر حصہ اُسکے مسئلہ ارتقا کو قابل تسلیم سمجھنے لگا۔ ایک زمانے تک ماہران سائنس کی یہہ کوشش رہی کہ ڈارون کے نظریہ کو عام فہم بنائیں اور اسکی صداقت کا ثبوت بہم پہونچائیں۔ زمانے کے انقلاب اور علم کی ترقی نے اب ایک ایسی جماعت پیدا کی ہے جسکا دعویٰ ہے کہ ڈارون کا مسئلہ ارتقا بالکل غلط ہے اسلئے کہ علم طبقات الارض اور علم حیات کے جن اصول کی بنا پر اسکا ثبوت دیا جاتا تہا۔ وہ خود غلط ہیں۔ ڈارون کے زمانے میں علم طبقات الارض کی حالت بچے کی سی تھی۔ مگر اب جب کہ اسنے خاطر خواہ ترقی کر لی ہے وہ پرانے اصول جن پر ڈارون اور اوسکے پیروٗن کے دعوی کا دار و مدار تہا لائق تسلیم نہیں رہے۔ گذشتہ وقت مخالف جماعت یعنی اہل کلیسا نے انجیل مقدس کے قصوں کو اپنا ہتیار بنایا تہا۔ جو سائنس کے مقابلہ مین کم زور اور بیکار ثابت ہوا لیکن آج کل تو سائنس کا سائنس سے مقابلہ ہے۔ دیکہیں میدان کس کے ہاتہہ رہتا ہے۔

انگلستان کے اکثر اطبا ایک زمانہ سے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ سرطان کے جراثیم کی ماہیت دریافت کریں اور اس مہلک مرض کا کوئی علاج تجویز کریں۔ لڈوگ الف۔ جو جرمنی کا ایک مشہور طبیب ہے اور جس نے اسکے متعلق بہت سی تحقیقات کی ہیں۔ لکھتا ہے کہ سرطان کے جراثیم کی تلاش مضحکہ خیز ہے کیونکہ ان جراثیم کا وجود ہی نہیں ہے۔ برسوں کا تجربہ بتلاتا ہے کہ ہزار میں ایک اوسط شخص ایسا ہوتا ہے جو چالیس سال سے کم عمر میں اس مرض میں مبتلا ہوتا ہے اور تیس سال سے کم عمر والے پر تو اسکا اثر ہی نہیں ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ سرطان کوئی مجرد مرض نہیں بلکہ قریب قریب ایک ہی قسم کی کئی بیماریوں کا مجموعہ ہے جس کا انسان کی عمر اور قوی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اگر جستجو کیجائے تو عکس ریز یا ریڈیم کی شعاعون سے اسکا علاج دریافت ہو سکتا ہے۔ بلکہ حفظ ما تقدم معلوم کرنے کا بھی امکان ہے۔

پروفیسر لانگ مائر کیلئے امریکہ کی ایک برقی کمپنی نے ایک معمل (LABORATOR
اپنی طرف سے بنا کر وقف کر دیا ہے اور انہیں ماہانہ اتنی تنخواہ دیتی ہے جس پر شاید اکثر وزراء کو بھی
رشک آتا ہوگا اسکا معاوضہ صرف یہی ہے کہ پروفیسر مذکور کبھی کبھی جب انہیں ایک آدھ دن کی فرصت
ہو تو کمپنی کے مسائل پر غور کریں گو ایک حد تک ذاتی فائدہ مدنظر ہے۔ مگر پھر بھی علوم و فنون کی
قدردانی کی یہ ایک سبق آموز مثال ہے۔

مسٹر فورڈ کی کامیابی کا ایک بہت بڑا راز یہ ہے کہ وہ اپنے کارخانے کے مزدوروں کو
معمول سے بہت زیادہ اجرت دیا کرتے ہیں۔ ان کا موٹر کا کارخانہ اس وقت ترقی کرنے لگا
جبکہ انہوں نے معمولی مزدوری سے دوگنی بلکہ تگنی اجرت دینی شروع کی۔ ملک کے تمام اچھے
کام کرنیوالے انکی طرف امنڈ آئے اور انکی صنعت اور تجارت دن دونی ترقی کرنے لگی۔
چنانچہ آج انکی ثروت اور تمول سے ساری دنیا واقف ہے۔ اب انہوں نے ایک جہاز سازی
کے کارخانے کی بنیاد ڈالی ہے جہاں کے مزدوروں کو روزانہ اکیس ڈالر تک ملتے ہیں دوسرے
کارخانوں میں مشکل سے پچاس ڈالر دئے جاتے ہیں ایسی حالت میں صاف ظاہر ہے کہ ان کے
یہاں کام کی رفتار کیا ہوگی۔

غلام حیدر

۷۸۶

یہہ پرچہ نومبر ہی میں شائع ہو گیا ہوتا مگر " سنگی طباعت کی دنیا کے جمود بے حسی اور بے پروائی کا عالم" آپ سے پوشیدہ نہیں۔

ہم نہایت مسرت کے ساتہہ نواب نظامت جنگ بہادر کے مکتوب گرامی کو شائع کرتے ہیں نواب صاحب ممدوح کی علم دوستی کا اعادہ اک تحصیل حاصل ہے۔ اس سے آپکو معلوم ہو جائیگا کہ نوجوانان ملک کی حقیقی فلاح و بہبود کے نواب صاحب کیسے خواہان ہیں در حقیقت جذبات کی پاکیزگی اور ہمت کی بلندی ہی اک کامیاب زندگی کے ضامن ہو سکتے ہیں" علم کو اپنی روزمرہ زندگی میں عمل کی صورت میں ظاہر کرنا" ہمارا مطمح نظر ہونا چاہئے ہمارا فرض اولین یہہ ہونا چاہئے کہ اعلیٰ اصول پر عمل پیرا ہونے کا عزم کر لیں اور اس سبق آموز ہدایت کو اپنا دلیل راہ بنائیں۔ طلبہ کے دل ابتدا ہی سے صاف جذبات عقیدت سے معمور ہیں اور یہہ نواب صاحب کی قابل قدر التفات اور ہمدردی کا نتیجہ ہے۔

تاریخ و اخلاقیات کے مضمون کیلئے ہم پروفیسر سلگمین کا احسان مند ہوں۔

" درس عمل" نواب نظامت جنگ بہادر کی ایک (SONNET) کا ترجمہ ہے جو ہمیں عنایت فرمائی گئی تہی ہمارے ہونہار دوست مسلم نے جس خوبی سے اس کا ترجمہ کیا ہے اسکی داد ہم آپ سے مانگتے ہیں۔

اگر شکریہ میں عمومیت نہ ہوتی تو جذبات تشکر کا اظہار بجا ہوتا۔

"دورانِ کائنات" اک پُر از معلومات مضمون ہے۔ محمد امیر خان صاحب نے ایک دقیق مضمون کو جس نفاست و خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس کا تصفیہ خود آپ فرمائیں گے ہمارے محترم دوست سے ہمیں آئندہ بہت توقعات ہیں۔

حضرت نظم طباطبائی کی محترم و مغتنم ہستی سے کون واقف نہیں طلبہ نظام کالج سے خصوصیت و ہمدردی حضرت کو رہی ہے اس کے مدنظر ہم متوقع ہیں کہ ہمیشہ حضرت کے عالمانہ قلم کے متبرکہ نقوش سے اس مجلہ کے صفحات مزین ہوا کریں گے۔

جناب شبیر حسن صاحب جوش۔ ملیح آبادی نے ہماری درخواست پر "غنچہ پژمردہ" کی نظم ہمیں عنایت فرمائی ہے آپ کی شہرت کسی مزید تعریف کی محتاج نہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمیشہ ہمیں اسیطرح ممنون فرمایا کرینگے۔

"جامعہ الازہر" کا مضمون
PIERRE ARMINGON
PIERRE CRABITES
کے مضمون کا ترجمہ ہے ابوالنصر فتح اللہ صاحب کے ہم مشکور ہیں۔

"نسب" ٹامس ہارڈی کی (HERIDITY) کا ترجمہ ہے مولوی عظمت اللہ خاں صاحب غضابی اے نے اردو شاعری میں اپنی جدت طرازی سے ایک ایسا امتیاز خصوصی پیدا کرلیا ہے کہ وہ ہماری مزید تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔

تاریخ برق کا بڑا حصہ گزشتہ میگزین میں چھپ چکا تھا ہمارا خیال تھا کہ اک مختصر مضمون میں یہ تاریخ مکمل ہوجاتی۔ سید محمد کرمانی صاحب نے اسکی تکمیل کردی ہے۔

جناب بشیر احمد صاحب منصرم تحصیلدار کلوا کرتی ضلع محبوبنگر نے ہمیں جو غزل بھیجی ہے ہم اسکو شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں تحصیلدار صاحب ممدوح موصوف نے اپنے خط میں ہماری ہمت افزائی فرمائی ہے جسکے ہم ممنون ہیں۔

ہماری درخواست پر جناب احسن نے جو غزل ہمارے یہاں بھیجی ہے اُسکو ہم شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں ہمیں توقع ہے کہ وہ اسیطرح آیندہ بھی ہمیں ممنون کریں گے۔

ہمارے یہاں بغرض اشاعت بہت سارے مضامین وصول ہوئے ہیں مگر افسوس ہے کہ بنظر طوالت کئی مضامین شایع نہ ہو سکے۔ کیا ہم طلبہ نظام کالج سے درخواست کر سکتے ہیں کہ وہ بجائے "شاعری" اور نفسیاتی مضامین کے (جن کا ذوق روز افزوں معلوم ہوتا ہے) اپنی توجہ کو تاریخی یا سائنٹفک مفید مضامین کے لکھنے کی جانب معطوف کریں گے۔
تخیل کی بلند پروازی بری نہیں اگر وہ اسقدر بلند رتبہ ہو سکے کہ اشاعت کے قابل ہو جائے۔

انسانی روحانیات" "حواس کی وجدانی کیفیت" "محبت کی دیوی"۔ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں افسوس کہ وہ اس اشاعت کیلئے منظور نہ ہو سکے۔

جناب سلطان علی صاحب کے ہم خصوصیت کے ساتھ مشکور ہیں کہ انہوں نے پروف پڑھے اور ہمیں ایک دیر طلب کام سے نجات دی۔

اڈیٹر

۲۲ ے ے

قواعد و ضوابط

(۱) نظام کالج اردو میگزین سہ ماہی رسالہ ہے۔

(۲) اس کی سالانہ قیمت مع محصول ڈاک (للعہ) سکہ کلدار ہے۔ ایک پرچہ کی قیمت مہ سکہ کلدار ہے۔

(۳) میگزین کی خریداری اور نرخ اشتہارات کے متعلق ٹکٹ بھیجکر منیجر سے استفسار فرمائیے۔

(۴) سیاسی اور مذہبی مضامین کسی حالت میں چھپ نہ سکیں گے لہذا ایسے مضامین بھیجنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیے۔

(۵) تمام مضامین اڈیٹر کے نام ارسال فرمائیے۔ خوشخطی کا ضرور لحاظ رہے۔ ناقابل اشاعت مضامین واپس نہ ہو سکیں گے اور اڈیٹر کو حذف و ترمیم کا حق حاصل۔

ترسیل زر کا پتہ

غلام حیدر

سکریٹری نظام کالج اردو میگزین

سید محمد کرمانی

منیجر نظام کالج اردو میگزین

اسد باغ ۔ نظام کالج ۔ حیدرآباد دکن

معتمد کی